پروفیسر ہارون خاں شروانی اردو انگریزی کے ممتاز مصنف اور تاریخ و سیاسیات کے ماہر ہیں، انھوں نے دونوں زبانوں میں مستقل کتابیں اور مضامین لکھے ہیں اور بعض کتابوں کے ترجمے بھی کئے ہیں، اس کتاب میں اُن کی اردو خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، یہ دراصل مصنف کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے ایم اے کے آخری سال کے پرچے کے لئے شعبۂ اُردو عثمانیہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا، یہ تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں شروانی صاحب کے سوانح اور اُن کے خاندان کی مختصر تاریخ اور اُس کے بعض نامور افراد کا اجمالی تذکرہ ہے، دوسرے باب میں اُن کے تراجم و تصانیف اور مضامین پر تبصرہ ہے اور انکی فہرست بھی دیدی گئی ہے، تیسرے باب میں اُن کی اُردو سے دلچسپی، اور اسکی ترقی کے لئے عملی کوششوں کا مفصل ذکر ہے، ایک زمانہ میں وہ آندھرا پردیش قانون ساز کونسل کے رکن بھی تھے، اس حیثیت سے انکو اُردو کی عملی خدمت کا زیادہ موقع ملا، مقالہ نگار نے ان خدمات کا جائزہ لینے کیلئے کونسل میں اُن کی تقریروں کے مفصل اقتباسات دیدئے ہیں، گو یہ کتاب ایم اے کے امتحان کا ایک مقالہ ہے، اس لئے بعض حیثیتوں سے اس میں کچھ خامیاں ہیں، تاہم محنت سے لکھی گئی ہے، اور نوجوان مرتب حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

اُردو ہے جس کا نام ..... از جناب ضیاء ہانی صاحب تقطیع خورد کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی صفحات ۴۰، قیمت ۲ روپیہ، پتہ: (۱) جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر نئی دہلی نمبر ۲۵

(۲) ضیا ہانی تعمیر ادب ۲۳ بندر روڈ، بھیونڈی: مہاراشٹر،

جناب ضیا ہانی بمبئی کے کوکنی گھرانے کے فرد ہیں، مگر وہ اردو کی خدمت کا بڑا ولولہ رکھتے ہیں، انکی یہ طویل نظم اردو کے ادیبوں اور شاعروں کا انڈکس، اور اردو ادب کی مختصر منظوم تاریخ ہے، سہولت کے خیال سے ہر بند کے مقابل صفحہ پر ادیبوں اور شاعروں کا مختصر نام بھی تحریر کر دیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں تخلص کے ذکر میں فرق ہو گیا ہے، مگر جیسا کہ خود مصنف نے لکھا ہے، یہ نظم نامکمل ہے اسلئے اس میں بہت سے نامور ادیبوں کے بجائے معمولی ادیبوں شاعروں اور ناشروں تک ہی محدود ہے تو اچھا تھا، سیاسی اشخاص کا ذکر بے محل ہے۔
"ض"

جلد ۱۱۷ ماہ جون ۱۹۷۶ء مطابق ماہ جمادی الثانی ۱۳۹۶ء عدد ۶

مضامین

شذرات

جو لوگ فارسی علم و ادب سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ ڈاکٹر محمد اسحاق کے نام اور کارناموں سے بخوبی واقف ہیں، انھیں فارسی سے والہانہ تعلق تھا، اور اس زبان کی خدمت میں وہ بڑی لذت و مسرت محسوس کرتے تھے، اُن کی آرزو تھی کہ ہندوستان میں اُس کی جڑیں مضبوط ہوں، اور زمانہ کے انقلاب کے باوجود اس کی بارآوری اور ثمر آفرینی میں کوئی کمی نہ ہو، اس خیال کے ماتحت سنہ ۱۹۴۳ء میں انھوں نے کلکتہ میں ایران سوسائٹی کا سنگ بنیاد رکھا، اور پورے ۲۵ سال تک اس کی خدمت میں لگے رہے، ایران سے دوری کے باوجود بنگال نے فارسی کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، کتابوں کے علاوہ فارسی اخبارات و رسائل کی اشاعت میں بھی اُس نے نمایاں حصہ لیا، دنیا میں فارسی کا سب سے پہلا اخبار مرآۃ الاخبار راجہ رام موہن رائے کی ادارت میں یہیں سے شائع ہوا، حبل المتین کے دیکھنے والے تو ابھی موجود ہیں، فارسی سے اسی مناسبت کی بنا پر ڈاکٹر محمد اسحاق مرحوم نے کلکتہ کو اپنی جد و جہد کا مرکز بنایا،

سنہ ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر محمد اسحٰق کا انتقال ہو گیا، لیکن اُن کے دوستوں اور قدر دانوں نے اُن کے مشن کو جاری رکھا، انگریزی اور فارسی کے رسالے پابندی سے نکل رہے ہیں، کتابوں کی اشاعت روز افزوں ہے، فارسی زبان کی تعلیم ترقی پر ہے، کتب خانہ میں بہت اضافہ ہو گیا ہے، اور علمی لکچروں کا سلسلہ بھی جاری ہے، گزشتہ مہینہ ایک سمپوزیم بھی ہوا، جس میں نامور اہل علم نے ان کوششوں کا جائزہ لیا، جو بنگال میں فارسی کی ترویج و اشاعت کے لئے اب تک کی گئی ہیں، اور ان مشکلات پر غور کیا، جو اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہیں، نیز وہ تدابیر بھی بتائیں جن سے فارسی کا مستقبل اس دیار میں روشن ہو سکتا ہے،

ہندوستان میں اقلیتوں نے بہت سے تعلیمی ادارے قائم کئے تھے تاکہ ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت ایسے ماحول میں ہو جو ان کی روایات سے ہم آہنگ ہو لیکن بعض عناصر موہوم مفاد کی امید میں ان کی یہ نوعیت ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہر چند کہ حکومت نے وضاحت سے کہہ دیا ہے کہ اقلیتیں اپنی پسند کے ادارے قائم کر سکتی ہیں، اور انھیں چلا سکتی ہیں، مگر اس کے باوجود یہ لوگ اپنی روش سے باز نہیں آ رہے ہیں، ان حالات پر غور کرنے کے لئے اقلیتی تعلیمی اداروں کی جنرل باڈی کی میٹنگ ۲۲ر اور ۲۳ر مئی ۶۶ء کو لکھنؤ میں ہوئی جس نے مفید لائحہ عمل مرتب کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ لائق اور فعّال کارکنوں کی مسلسل جد و جہد کے باوجود اقلیتی اداروں کے منتظمین کے اندر ابھی تک خاطر خواہ بیداری نہیں پیدا ہوئی، غفلت کی انتہا یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد ابھی تک تنظیم سے علٰحدہ ہے، اور جو لوگ شامل ہیں، وہ بھی اسکی ضروریات سے غافل ہیں، حالانکہ حالات کا تقاضا ہے کہ سب اس جد و جہد میں شریک ہوں، اور اپنی تائید و اعانت سے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کریں، ورنہ چند بے سہارے ملاح کب تک منجدھار میں کشتی چلاتے رہیں گے،

دینی اور علمی حلقوں میں شاہ فخر عالم بھاگلپوری کی وفات کی خبر بڑے رنج و افسوس کے ساتھ سُنی جائے گی، اُن کے نامور بزرگ سید ظہیر الدین سنہ ۱۲۷۵ھ میں دہلی آئے، اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے، انھوں نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے پوتے مخدوم رکن الدین رکن عالمؒ سے بھی اکتساب فیض کیا، اس طرح اس خاندان میں چشتی اور سہروردی دونوں نسبتیں جمع ہو گئیں، بعد کو یہ خاندان دہلی سے بہار آ گیا، اور حضرت سید علی محمد (ڈمڑیا بابا) نے بھاگلپور میں قیام فرمایا، اس وقت سے یہ لوگ یہیں آباد ہیں، اور اُن کی خانقاہ "ڈمڑیا بابا" کے نام سے موسوم ہے، شاہ فخر عالم مرحوم اسی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے، وہ دینی مشاغل کے ساتھ علمی مذاق بھی رکھتے تھے، اُن کا کتب خانہ اُن کے علمی ذوق کا شاہد ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اُن کو اپنی عنایتوں اور

رحمتوں سے شادکام کرے، اور ان کے جانشین سید شاہ شرف عالم ندوی کو اپنے بزرگوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے،

جناب محمد یوسف صاحب صدیقی کی وفات بھی باعثِ رنج و ملال ہے، وہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کے کلاس فیلو تھے، تحریک ترک موالات کے اثر سے سنہ ۱۹۲۰ء میں وہ جامعہ آئے، کچھ عرصہ کے بعد معاشی مسائل میں لگ گئے، لیکن تحریک خلافت اور ترکِ موالات کا اثر ان کے دل سے کبھی نہیں گیا اسی اثر کے ماتحت وہ جماعتِ اسلامی میں شامل ہوئے، اور قومی و ملی تحریکوں سے دلچسپی لیتے رہے، جامعہ کی محبت بھی برابر ان کے دل میں جاگزیں رہی، اور اس کے اہم جلسوں اور تقریبوں میں حتی الامکان شریک ہوتے رہے، ان کی دینداری، خلوص اور وضع داری ہمیشہ یاد رہے گی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، اور ان کے پس ماندگان کو حق پسندی اور نیک روی کی توفیق نصیب فرمائے،

یہ سطور ابھی زیر تحریر تھیں کہ جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے سربراہ اعلیٰ مولانا حافظ عبد العزیز کی وفات کی اطلاع ملی، ان کی عمر اسی سال سے متجاوز تھی، مگر ابھی یہ خیال نہ تھا کہ وقت موعود اتنا قریب آچکا ہے، وہ بریلوی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتے تھے، مگر مزاج میں اتنا اعتدال تھا کہ دوسرے حلقہ کے لوگوں سے بھی خندہ پیشانی اور فراخ دلی سے ملتے تھے، علمی مشاغل کے ساتھ عبادت و ریاضت سے بھی خاص شغف تھا، راقم الحروف نے ۱۹۶۰ء کے موسم حج میں ہندوستانی سفارتخانہ کی ایک تقریب میں پہلی بار انھیں دیکھا تھا، اور ان کی سادگی، احتیاط، اور زاہدانہ زندگی سے متاثر ہوا تھا، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رحمت و مغفرت کا معاملہ فرمائے، اور ان کے اہل و عیال اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل، اور دین و ملت کی پرخلوص خدمت کی توفیق عطا فرمائے،

مقالات

سعید نفیسی کے چند تسامحات

از ڈاکٹر (مسز) ام ہانی فخر الزماں صاحبہ، ریڈر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

(۲)

۱۹- سیف الدین محمود متخلص بہ سرجانی (نفیسی ج ا ص ۵۰۰) م از بزرگ زادگان اصفہان و در دفترخانۂ شاہ محمد خدابندہ کاتب رسمی بودہ، از شاعران توانائی روزگار خود بشمار میرفت (نفائس المآثر ورق ۵، علی گڑھ) از اقوام و عشائر خواجہ کمال الدین اسمعیل است در فنون شعر مہارت تمام داشت و بسیار خوب میگفت، در علوم ریاضی و نجوم و رمل صاحب وقوف بودہ و در فن سیاق نظیر نداشت، بحسب ظاہر فارغ بقلیل بودہ و طمعی و توقعی نمی نمودہ، اما از شرارت کہ آثار کفایت دیوان نام نہادہ بود خالی نبود۔ در مشہد منور در سنہ اثنی و ثلثین و تسعمایہ بر دست رنود و اوباش کشتہ شد"

(تفصیل کے لئے خاکسار کا مقالہ "دسویں صدی ہجری کے دور جانی" ملاحظہ ہو "معارف" دسمبر سنہ ۱۹۶۶ء ص ۴۶۸-۴۷۳)

۲۰- شرف جہان قزوینی (نفیسی ج ا ص ۳۹۶) "عاقبت در روز یکشنبہ ۷ ذیقعدہ ۹۶۹ ہنگام چاشت در ۵۰ سالگی در روستای درکوہپایۂ قزوین درگذشت ......

میرزا اشرف جہاں کہ شرف تخلص می کرد از شاعران زبردست زمانِ خود بشمار میرفت و قصیدہ و غزل را نیکو می سرُودہ است"

نفائس المآثر (برگ ۹۳ الف، علی گڈھ) در روز یکشنبہ ہفتم ماہ ذیقعدہ سنہ ثمان و تسعین و تسعمایہ مولانا حجازی در تاریخ گفتہ:

میداشت چوں جہاں شرف از میرزا اشرف   با او شرف ز ملک جہاں تو اماں شدہ
جستم حساب سال وفاتش زپیر عقل   فرمود آہ آہ شرف از جہاں شدہ" (۹۸۶ھ)

اسی سنہ وفات اور قطعۂ تاریخی کو گلچیں نے بھی "میخانہ" (ص ۱۵۲) میں صحیح مانا ہے اور ایک ساقی نامہ بھی درج کیا ہے جو شاید نفیسی صاحب کی نظر سے نہیں گذرا تھا۔

۲۱۔ شکر اللہ شکری (نفیسی ج ۲ ص ۱۴۰۸) پسر قاضی صفی الدین علیؒ......

متولد در ۹۴۲ کہ پیش از این از احوالش آگاہی نیست نیز شاعر بودہ"

(نفائس المآثر (برگ ۹۲ الف، علی گڈھ) سیدزادہ قابل است و مقدمات علمی دیدہ و اکثر شرح مواقف و شرح تجرید خواندہ و الحال در خدمت جالینوس الزمانی حکیم الملک گیلانی کہ ذات ملکی صفاتش حاوی اشتات فضائل و کمالات است بمطالعہ تفسیر قاضی بیضاوی با حواشی مولانا عصام الدین و خطیب زادہ و ابن تمجید رومی و شیروانی و غیرہم باستحقاق اشتغال می نماید۔ طبعی بغایت بدریافت شعر مناسب دارد گاہے بترتیب نظمی متوجہ می باشد" این ابیات ازوست:

نازک تراست گفتہ ام از مو میان ترا   ناید اگر بخاطر نازک ترا
آں شوخ شد مرہم ریش دل افگار   دردا کہ ز بیماری دل نیست خبردار

باید گریہ کردن دمبدم بر روز گار من   کہ من محروم و دشمن محرم اندر بزم یار من

خوں شد ز ہجر تو جگر چاک چاک من   از ہجر نیست چارۂ دل جز ہلاک من

نمی تواں بتو گفتن حکایتے کہ مراست   خدای را بکہ گویم شکایتی کہ مراست

غرور در سر و بیرحم و شوخ و بیباک است   بکار سد بغمی بی نہایتی کہ مراست

امروز برت غیر ز غم رستہ نشستہ   فرداست بر و زمن دل خستہ نشستہ
شکری اگرش نیست بتو میل نشستن   در بزم چرا از تو خبر جستہ نشستہ

ز درد چشم نی با دیدۂ خونبار بنشستم   بغیرش تا نہ بینم دیدہ را از خون دل بستم

دوای عشق تو گفتم مگر سفر باشد   ہماں ز عشق توام داغ بر جگر باشد

دگر صبر و آرامم از دل بدر شد   کہ نامہربانی مرا ہمسفر شد
ہمہ عمر آشفتۂ عشق بودم   ولی حالم این بار آشفتہ تر شد

چونکہ میر علاء الدولہ (صاحب نفائس المآثر) شکری کا حقیقی چچا تھا، اور خود شکری کی کوئی کتاب نہیں، اس لئے نفائس المآثر کی تمام اطلاعات درج کر دی گئیں۔ شکری کے بارے میں اس سے زیادہ معتبر ماخذ نہیں مل سکتا

۲۲۔ شاہ ابو المعالی شہیدی کاشغری (نفیسی ج ۲ ص ۶۸۳) "میرزا سلیمان ویرا گرفتار کردہ بمحمد حکیم میرزا سپردہ بود وی او را بقصاص قتل مادر خود در ۹۷۹ کشتہ است"۔

نفائس المآثر (برگ ۹۸ الف، علی گڈھ) بمو جبا و سببی در وقت فرصت بقائی جہات بیگم را بدستہ خنجر ستم و بیداد برباد می دہد و این واقعہ سیزدہم شعبان سنہ احدی و سبعین و تسع مایہ بعمد در انجامد ... بموجب و لکم فی القصاص حیوۃ شاہ ابو المعالی ... از حلق کشیدہ رخت فتنہ انگیزی او را بیاد می آوردند

از روز شہادت یکم تا روز قتل چہل روز بیش نکشیدہ“

یعنی ابو المعالی کا قصاص رمضان ۹۷۱ھ میں ہو گیا تھا۔

دوسرا نکتہ قابلِ توجہ یہ ہے کہ ابو المعالی کا تخلص شہیدی نہیں تھا جیسا کہ نفیسی صاحب نے لکھا ہے، بلکہ مشہدی تھا اور اس تخلص کے ساتھ اس کے اشعار بھی نفائس المآثر میں موجود ہیں:۔

مشہدی از آزار جویان رو بہ بیزاری منہ — گر رسد آزار از وی بیزار بودن ننگ نیست

بود ز طالع بخت خجستہ مشہدی — بسوی کعبۂ وصلت اگر روانہ شوم

۲۳۔ شجاعی، سیف الملوک دماوندی (نفیسی ج ۱ ص ۱۸۵) ”از پزشکان حاذق زمان خود بود، از ایران بہند رفتہ در آنجا می زیست و بیرم خان خانخانان وی را گرامی میداشت و چون اتفاقاً بعیادت ہر کس میرفت آن بیمار می مرد لہٰذا ورا سیف الحکماء لقب دادہ بودند“

فن طب میں شجاعی کی حذاقت اور نتیجۂ علاج میں بڑا تضاد ہے، پزشکان حاذق میں شمار ہوتا تھا، مگر کوئی مریض جانبر نہ ہوتا تھا، دوسری بات ہندوستان میں اس کے مربی کے متعلق ہے،

نفائس المآثر (برگ ۱۰۲ علی گڈھ) ”در شہور سنۃ سبعین و تسعمایۃ بہندوستان آمدہ مرفہ در این دیار بود و از ارباب دولت این دیار توشہ یافتہ“

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۱۶۲-۱۶۳ و ص ۳۶۲-۳۶۴) بھی نفیسی صاحب کے ساتھ متفق اللفظ ہے، کہ وہ بیرم خاں کی زیر تربیت رہا، لیکن اگر نفائس المآثر کے بیان کے مطابق ہندوستان میں اس کا ورود ۹۷۰ھ یا اس کے بعد ہوا ہے تو ...

بیرم خاں کی تربیت ممکن نہیں کیونکہ اس کی شہادت ۹۶۸ھ میں ہو چکی تھی، (نفائس نے بیرم خاں کی تربیت کا کوئی ذکر نہیں کیا)

۲۴۔ شوقی یزدی (نفیسی ج ۱ ص ۶۵۲-۶۵۳) ”از و رباعیات ماندہ است“ (یعنی اس کے علاوہ کچھ نہیں) نفائس المآثر (برگ ۴۰۸ ب، علی گڈھ) غزل کے حسب ذیل اقتباسات دیئے ہیں:

بسکہ سیل مژہ از ہر طرفی سویش رفت — کوچہا گل شد و نتوان بسر کویش رفت

طریق عزلتم از عجز بینوائی نیست — مرا بخلق جہان میل آشنائی نیست

شب تا بروز گریۂ جانسوز می کنم — بیتو شبی بخون جگر روز میکنم

بسکہ در عشقت میان مردمان رسوا شدم — مینمایندم بہم از دور چون پیدا شوم

در جواب قصیدہ مولانا امیدی دارد،

اے رخت ماہ اوج زیبائی — قامتت سرو باغ رعنائی

سرو و گل را اگر بود با تو — دعوی حسن و لافِ زیبائی

سرو بر جا نماند از خجلت — چون خرامان بباغ فرمائی

گل ز شرم رخ تو آب شود — اگر از پردہ روی بنمائی

ماہ را با رخ تو نسبت نیست — سرو را با قد تو ہمتائی

سرو آزادہ ایست گوشہ نشین — ہرزہ گردیست ماہ ہر جائی

در جواب قصیدۂ (؟) گل مشہور گفتہ:

شاخ گل را ز تفاخر سر گردون بگذرد — تو گل من گر زند بر گوشۂ دستار گل

تحفۂ سامی (ص ص ۵۶-۵۷) ”و در این قصیدہ مولانا امیدی را تضمین کردہ خوب واقع شدہ“۔

ای تو شاہ سریر دلجوئی — وی تو سلطان ملک زیبائی
روز میدان ز خرگہ لعلی — چون گل از غنچہ گر برون آئی
عزم میدان کنی و چون خورشید — عالم از روی خود بیارائی
زلف چوگان صفت بدوش نہی — وز بنان گوی عشق بربائی
شاہ خوبان عالمی و ترا — ما گدا پیشگان گدائی

وفات عاشقین نے مندرجۂ ذیل اقتباس دیا ہے:-

مدام این آرزو دارم کہ برگرد سرت گردم — بگرد خاطرم این آرزو بسیار میگردد

۴۴۔ شعوری تربتی (نفیسی ج ۱ ص ۵۴۷) "از شاعران این دورہ بودہ کہ در عہد جلال الدین اکبر از ہندوستان بایران رفتہ و غزل سرا بودہ"

نفائس المآثر (برگ ۱۰۵ الف علی گڑھ) اس کا نام ابو القاسم بتایا ہے اور میرزا محمد سلیم اور شہزادہ مراد کی تاریخ ولادت کا معمہ بھی اس سے منسوب کیا ہے:-

شاہا خردم کہ در معنی می سفت — از بہر دو شہزادۂ عالم میگفت
گردید دو تاریخ کہ یکسان دو گل — بر گلبن دولت بصد اقبال شگفت

یعنی

بر گلبن دولت بصد اقبال شگفت = ۹۸۰ - ۱ (یک) - ۲ (دو) = ۹۷۷ ـــ سال ولادت سلیم

بر گلبن دولت بصد اقبال شگفت ۴ + ۴ (یک، دو) = ۹۷۸ ـــ سال ولادت مراد

۴۵۔ شعوری بخاری (نفیسی ج ۱ ص ۶۲۹) اس کے سفر ہرات اور بہار الدین نثاری بخارائی کی سفر سے مخالفت کا حال لکھا ہے، مگر سنہ وفات درج نہیں کیا،

نفائس المآثر (برگ ۱۰۵ الف، علی گڑھ) درج کیا ہے،

۴۶۔ شیخ صفی الدین صفی نوربخش (نفیسی ج ۱ ص ۶۱۸) اس کا بہت مختصر حال لکھا اور کوئی تاریخ نہیں لکھی

نفائس المآثر (برگ ۱۰۶ ب، علی گڑھ) کچھ تفصیلی حالات دینے کے بعد سنہ وفات "در شہور سنہ سبع و ستین و تسعمایہ" لکھا ہے،

۴۷۔ صبوحی چغتائی (نفیسی ج ۱ ص ۶۵۳) صبوحی از شاعران مقیم ہندوستان و سفر حج کردہ و میخوارہ نیز بودہ۔ و در ۹۷۳ درگذشتہ و غزل را خوب می سرودہ است"

نفائس المآثر (برگ ۱۰۸ الف، علی گڑھ) اس قصیدے کا تھوڑا سا اقتباس بھی دیا جو اس نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں کہا تھا،

از آن دو چشم کہ ہر یک بغمزہ عین بلاست — نشان تیر بلا گشتہ ایم از چپ و راست
عنایتی کہ بمن دارد آن جفا پیشہ — گہی عتاب گہی ناز و گاہ استغناست
دلم کہ مہر تو دارد ہمین تو میدانی — نگفتہ ام بکس این راز را خدا داناست

وفاتش در دار الخلافہ آگرہ در سنہ اثنی و سبعین و تسعمایہ بودہ،

صبوحی چو میخوار بود "صبوحی میخوار" تاریخ شد = ۹۷۳

خود نفائس المآثر (برگ ۱۰۸ الف، علی گڑھ)، منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۲۵۶-۲۵۷) اس کے انگریزی ترجے اور نشتر عشق صبوحی میخوارہ سے مادہ تاریخ نکالا ہے، ۹۷۳ آتا ہے، نفائس المآثر علی گڑھ نے "صبوحی میخوارہ" لکھا ہے، ۹۷۸، لیکن اگر اس کو "صبوحی میخوار" (بغیر الف کے) لکھا جائے تو عدد مذکور ۹۷۲ نکلتا ہے

۴۸۔ صرفی۔ شیخ صرفی کشمیری (نفیسی ج ۱ ص ۷۷۰) "در ذیقعدہ ۱۰۰۳ درگذشت و تاریخ رحلت وی را "شیخ امم" یافتہ اند"

یہ مادہ تاریخ نامکمل ہے۔ اس سے صرف ۹۹۱ نکلتے ہیں۔ منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۱۸۱)
میں "شیخ امام بودہ" (= ۱۰۰۳) لکھا ہے۔

۲۹۔ صدر جہاں (نفیسی ج ۱ ص ۵۴۱) کا مختصر حال درج کیا ہے۔ مگر کوئی تاریخ درج نہیں
کی اور لکھا ہے، "از اعیان دربار بابریان بشمار میرفت"
پتہ ہی نہیں چلتا کہ دسویں صدی کے کس زمانہ میں تھا، درآنحالیکہ وہ اس کے بعد گیارہویں
صدی تک زندہ رہا۔

عرفات عاشقین "صدر جہاں از امرای عظیم الشان اکبر بادشاہ و نور الدین جہانگیر
بودہ است، باآنکہ از عمر طبعی او از صد سال متجاوز شدہ ہنوز دراں شعور و حواس و در عین
بزرگی و ہمت است و دریں سن از خدمت حضرت جہانگیری تساہل نمی نماید۔ و در سنہ ہزار و
بیست و سہ بصحبت وی در رسیدم، الحق اقسام سخن را نوعی گفتہ و ذوق کلام بسیار دارد و
در ہزار و بیست و ہفت خبر فوت او شنیدم"

۳۰۔ طالب گیلانی (نفیسی ج ۱ ص ۵۲۰ و ج ۲ ص ۸۳۳)
دو جگہ ترجمہ حال درج کیا ہے، جس میں حسب ذیل اضافہ ضروری ہے،
(تحفۂ شاہی: (ص ۵۵) و گویند درآن فن (طبابت) رسالہ ای تصنیف کردہ"
نفائس المآثر (ورق ۱۱۷ ب، نسخۂ علی گڈھ) شب پنجشنبہ چہاردہم ذی الحجہ سنہ سبع
و تسعین تسعمایہ روز تاریخ وفات

۳۱۔ طارمی علی (نفیسی ج ۱ ص ۴۸۱) اس کا ترجمہ حال بھی دو جگہ لکھا ہے،
"خیال از دانشمندان ایران و از طارم بودہ بہمیں جہت طارمی تخلص می کردہ
...... در زمان جلال الدین محمد اکبر بہندوستان در آمد و در آنجا در گذشتہ است و از دانشمندان

زمان خود بودہ و در عربستان علم حدیث را فرا گرفتہ بود، بسیار پرہیزگار بودہ و برادرش
نیز از دانشمندان معروف بودہ است، وی غزل را خوب میگفتہ است"
(نفیسی ج ۲ ص ۸۴۳) "تخت ندیم ہمایوں بودہ و در گذشت وی را در اکبرآباد
در ۹۸۱ ہم نوشتہ اند"

(نفائس المآثر (ورق ۱۱۸ الف) علی گڈھ) نے تفصیل اور دلیل کے ساتھ لکھا ہے،
"طارمی تخلص مولانا علی ست، مولد و منشای او طارم است، مولانا در بدو
حال بنابر مناسبت ذاتی بکابل و ہند آمدہ۔ در میان طبقۂ چغتائی نشو و نما یافتہ
در شہور سنہ ثمان و خمسین و تسعمایہ بعزم دریافت حج بعربستان رفتہ زیارت حرمین
شریفین زادہما اللہ تعظیماً و تحریماً نمودہ مدت سہ سال در آں اماکن شریفہ بتحصیل علوم
شرعیہ اشتغال فرمودہ اسناد عالیہ حاصل کردہ و تصحیح کتب معتبرہ نمودہ و چوں
فتح ہندوستان شدہ، باینجا آمدہ...... مولانا در روز یکشنبہ در شہر جمادی الاولی
سنہ احدی و ثمانین و تسعمایہ در آگرہ بجوار رحمت ایزدی پیوست مولانا عارف عالم
کابلی در تاریخ فوتش گفت:

دریغا کہ ناگاہ ملا علی را — ربود از میان دست برد حوادث
پی سال او سال دیگر — بگو "مردہ ملا علی محدث"
(۹۸۲-۱=۹۸۱)

۳۲۔ عاشق، ابو الخیر سمرقندی (ج ۱ ص ۶۵۴) صرف اسی قدر لکھا ہے،
"مردی دانشمند و در نزد پادشاہان محترم بودہ"، پھر سنہ وفات دیگر لکھتے
ہیں، "ورباعی از او ماندہ"

چونکہ وہ احترام غیر معمولی تھا، اس لئے اس کا ذکر ضروری ہے، نیز یہ کہ انھوں

نے رُباعی کے علاوہ اور بھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے،

(نفائس المآثر (برگ ۲۲ ب، علی گڈھ) "مولانا از میانکال سمرقند است، عالم تبجر بغم بوده واکثر علوم را کما حقہ ضبط نموده، بتخصیص علم حکمت، طب و ہیئات و نجوم کہ در آں علوم مہارت تمام داشتہ و بغایت خوش طبع بوده و در زمان سلطان حسین میرزا بہرات رفتہ و در خراسان بین العلماء بلطف طبع و قوت ذہن ممتاز بوده اند ادراک صحبت اکابر آنجا نموده و چوں محمد خان شیبانی بر خراسان مستولی شده مولانا ابو الخیر ہمراه ایشاں بما وراء النہر رفتہ اند و آنجا اکثر اوقات بافاده مشغولی می نموده اند و اکثر در خدمت خان مغفور عبید اللہ خاں می بوده و نوبتی در خدمت خان مذکور بخراسان آمده بوده و در نیشاپور روزیکہ جمیع سلاطین ماوراء النہر و ترکستان در خانۂ خان مرحوم حاضر بودند کیتن قرا سلطان راکہ والی بلخ بوده بمزید التفات ممتاز فرموده نزد خود طلب فرموده از روی عنایت باو گفتہ اند کہ "امروز ہرچہ از ما طلب کنی بتو شفقت کنیم"، سلطان مذکور بعد از تامل گفتہ اند کہ مولانا ابو الخیر را اگر ببنده گذارند موجب سرفرازی بنده خواہد بود کہ در ملازمت ایشاں باشم" عبید اللہ خاں را ایں حسن اختیار بسیار خوش آمده، چہ ایں دلیلی ست تمام بر استقامت سلیقۂ آں سلطان سعادت فرجام و خدمت مولانا را رخصت نموده کہ با ایشاں باش۔ سلطان مذکور با مولانا بایں عنوان بوده کہ ہرگاه مولانا را رجوعی بحضور سلطان شدی کس فرستاده سلطان را طلب نمودی و سلطان در ساعت حاضر گشتہ بخدمات مرجوعۂ مولانا قیام و اقدام نموده و جمیع علماء و اکابر دار الملک قبۃ الاسلام بلخ ملازمت ایشاں را لازم میداشتہ از افادات ایشاں مستفید و بہره ور بوده اند، قصائد مرغوب دارد۔ ایں بیت از وست:

بدورِ عدل تو اضداد در اہم الفت	چنانکہ موی نگنجد میانہ شب و روز

ایں مطلع غزل از ایشاں مشہور است:۔

بشہر از قامت ہر سو قیامتہاست میگوئی	قیامت قامتی داری مرہ من راست میگوئی

۳۳ - سید جمال الدین محمد عرفی شیرازی (نفیسی ج ا ص ۱۷ا۴)

"در بارۂ مرگش اختلاف است بعضی نوشتہ اند با سہال رفت و برخی گفتہ اند بواسطۂ ہماں روابطی کہ با شہزادہ سلیم داشت زہرش دادند"

علامہ شبلی نے شعر العجم (ج ۳ ص ۹۱) میں زہر دینے کی روایت والہ داغستانی کے حوالے سے لکھی ہے، جو باعتبار زمانہ زیادہ معتبر نہیں، یعنی اگر کوئی شخص ۹۹۹ سنہ کی بات کو بغیر مستند حوالوں کے ۱۱۶۱ سنہ (زمانہ تالیف ریاض الشعراء) میں کہتا ہے تو وہ کیونکر قابلِ قبول ہو سکتا ہے، مولانا شبلی نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ کچھ لا معلوم الاسم راویوں کے حوالہ سے یہ بھی کہہ ڈالا کہ اس نے شاہزادہ سلیم کے ساتھ اظہار عشق کیا تھا، ہو سکتا ہے کہ اس نے شاعری کے زعم میں کہیں کوئی ایسی بات کہہ دی ہو تو یہ کسی بھی زمانے میں کوئی ناقابل معافی جرم نہیں ہوتا، خصوصاً وہ زمانہ جہاں شاعری (اور ضمناً اظہار عشق) آب و ہوا میں بسا ہوا ہو، کیا اسی کو نفیسی صاحب نے "ہماں روابطی" کہا ہے، مگر کسی نے معاصر مورخ یا تذکرہ نویس کا حوالہ نہیں دیا۔ اگر اس میں کوئی اصلیت ہوتی تو ملا عبد القادر بدایونی ہرگز اس کو نہ بخشتے تا انھوں نے (منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۸۵) میں صرف اسی قدر لکھا ہے "بس عجب و نخوت پیدا کرد۔ از دلہا افتاد بہ پیری نرسید"، مگر استاد نفیسی اس ضعیف روایت کو زیرِ قلم لے آئے،

۲۴۔ قاضی علائی گرہرودی (نفیسی ج ۲ ص ۱۱۱۷) میں صرف اسی قدر لکھتے ہیں :۔

"از مردم گرہرود قم و منشی و دانشمند بودہ و غزل میگفتہ است"

(نفائس المآثر (برگ ۲۴۴ (الف) علی گڈھ) وفاتش در شہور سنہ ثلثین و تسعمایۃ در اصفہان

اتفاق فتادہ و قاضی زادہای گرہرود کہ از مشاہیر اند فرزندان ایشاں اند، قاضی جہاں

بغایت خوش طبع و بحاث و دانشمند بود، بعضی بدگوئی ایشاں نزد شاہ طہماسپ نمودند ایشانرا

در قلعہ الموت مقید ساختند، قاضی جہاں در آں فوت شد"

تحفۂ سامی (ص ص ۴۷-۴۸) در اوائل حال منصب انشای بعضی از سلاطین بدو تعلق

داشت۔ و بعد ازاں گاہی در اصفہان و گاہی در تبریز بسر میبرد"

خلاصۃ الاشعار "با اکابر و سلاطین انس تمام داشتہ لیکن درین اثنا ہموارہ بہ لہو و

لعب و عیش اوقات مسرت انجام بپایاں می رسانیدہ، گویند گنجفہ ہائے چند کہ درمیان

سلاطین شیوع تمام دارد از مخترعات ذہن صافیۂ اوست و الحق در وضع آں قمار و در ترتیب

آں بجہت تشحید خاطر اختراعی تازہ فرمودہ اند و تصنیفی بے اندازہ بعرصۂ ظہور رسانیدہ لیکن

دیوانی از وی درمیان مردم نیست"

عرفات عاشقین : درۃ التاج قاضی زادگان آنجاست، بغایت فاضل و دانشمند و

عالی فطرت بودہ"

۲۵۔ عسکری (نفیسی ج ۱ ص ۴۰۷) در ۹۶۱ درگذشت

(نفائس المآثر (برگ ۲۴۴ (الف) علی گڈھ) "عسکری بادشاہ دریا دل" (= ۹۲۲)

تاریخ فوت اوست"

۲۶۔ عبیداللہ خان ازبک (نفیسی ج ۱ ص ۴۸۴) در انواع شعر دست داشتہ و

و شعر فارسی او تا اندازہ خوب ست"، مگر تخلص نہیں لکھا ہے، نفائس المآثر (برگ ۲۶ (الف)

علی گڈھ) میں عبیدی یعنی تخلص ہی کی سرخی دی ہے، اور کہتا ہے :۔

قدرت بر نظم عربی چوں فارسی بغایت داشتہ دریں غزل معلوم می گردد۔

حیرنی جمالہ انظر فی کمالہ — کل لسان واصف فی صفۃ جمالہ

و ضعفنی فاقہ کمثلہ اشتیاقہ — احرقنی فراقہ فی طلب وصالہ

عز وجل ذکرک و لا الہ غیرک — حیر کل واصف فی صفۃ جمالہ

من عشق لقائک یحرقہ فراقک — کیف یکون حالہ من رحم بحالہ

طالبک عبدک انہ یرید لک — فاعطہ مرادہ لا انت مرادا لہ

نفائس المآثر (برگ نسخۂ رامپور)

"ملا عصام الدین ابراہیم بریں غزل شرحے نوشتہ"،

۲۷۔ شاہ عادل لاری (نفیسی ج ۱ ص ۴۱۶) "تاریخ کشتہ شدن او را در ۹۵۰ ضبط

کردہ اند...... غزل را خوب میگفت و عادل تخلص می کردہ است"

(نفیسی ج ۲ ص ۸۳۶) "شاہ عادل لاری، برخے تاریخ کشتہ شدنش را در ۹۹۲ ضبط کردہ

اند و درست نیست"

۹۵۰ کو کیوں نہیں قبول کیا، اور دوسری تاریخ کو کیوں رد کیا کچھ نہیں معلوم ہوتا،

نفائس المآثر (برگ ۱۲۷ (الف) علی گڈھ) تاریخ شہادت اثنی و خمسین و تسعمایہ......

دیوان او در کتاب خانہ شریفہ حضرت اعلیٰ (اکبر) یافتہ شد در آنجا شاہی تخلص نمودہ چنانچہ

اس کے اقتباسات میں حسب ذیل اشعار موجود ہیں، جن سے عادل اور شاہی دونوں تخلصوں کی

تصدیق ہوتی ہے :۔

گشتن عادل تر ایج تفاوت نکرد — بادشہ محترم قدر گدا ی نداشت

می لعل نوش و رخ دلبراں ببیں — کہ حیف است شاہی جزیں گر تو دانی

۳۸۔ خان اعظم میرزا عزیز کوکلتاش (نفیسی ج ا ص ۵۴۹) اس کے متعلق ایک اہم تاریخ درج نہیں کی یعنی ان کے حاکم گجرات ہونے کی تاریخ، علاء الدولہ قزوینی مصنف نفائس المآثر اس وقت شخصاً موجود تھا۔ اس نے حسب ذیل قطعۂ تاریخی کہہ کر میرزا کو پیش کیا جو موصوف کی خوشنودی کا باعث ہوا،

خان اعظم (ما) ز دولت اکبر شاہ — شد حاکم گجرات علی رغم عدو

تاریخ چو جستم ز دلِ خوردہ شناس — گفتا کہ شب برات دادند بدو = ۹۸۰)

(نفیسی در ۱۰۳۴ در گجرات درگذشت"

تزک جہانگیری (جشن نوزدہمیں نوروز ص ۳۹۵)

"وفات خان اعظم در شہر احمد آباد گجرات در سال ہزار و سی و سہ ہجری اتفاق افتاد دلاش او را بدہلی بردہ بجوار رحمت سلطان المشائخ نظام الدین قدس سرہ نزدیک بقبر پدرش بخاک سپردند" (مآثر الامرا (ص ۶۸۹)

(ملاحظہ فرمایئے مقالۂ خاکسار خان اعظم میرزا عزیز کوکہ اور اس سے متعلق شعرا ر فکر و نظر، جنوری ۱۹۶۱ء ص ۱۱۹-۱۲۷)

۳۹۔ میر عبدالحیٔ مشہدی (نفیسی ج ا ص ۵۴۹) تاریخ وفات درج نہیں کی،

نفائس المآثر (برگ ۱۲۸ (الف) علی گڑھ) وفاتش در شہور ثمانین و تسعمایہ در حضرت دہلی بوقوع انجامید"

۴۰۔ عشقی کاشانی (نفیسی ج ا ص ۴۷۰) "در ۹۶۰ درگذشت"

نفائس المآثر (برگ ۱۲۹ (الف، علی گڑھ) "وفاتش در سنہ خمس و ستین و تسعمایہ بودہ۔

۴۱۔ عتابی نجفی۔ (نفیسی ج ا ص ۳۳۴) نفیسی صاحب نے اسکے بارہ میں کوئی سنہ نہیں لکھا،

نفائس المآثر (برگ ۱۳۲ (ب) علی گڑھ) "حالا کہ سنہ ۹۹۸ کہ موافق ثمان و تسعین و تسعمایہ است در قلعۂ گوالیار قید است"

۴۲۔ علاء الدولہ بن یحییٰ بن عبداللطیف سیفی قزوینی حسنی متخلص بکامی کو نفیسی صاحب نے اس ضخیم تصنیف میں کئی جگہ یاد کیا ہے،۔

(نفیسی ج ا ص ۳۸۳) "میرزا علاء الدولہ بن یحییٰ سیفی حسنی قزوینی پسر امیر یحییٰ بن عبداللطیف مورخ معروف زمان خود نیز از تاریخ نویسان قرن دہم بشمار میرفتہ و مولف کتابیست بنام نفائس المآثر در احوال شعرا کہ در ۹۷۳ بتالیف آں شروع کردہ و تا وقائع جمادی الاولیٰ ۹۷۹ در آں آوردہ و نیز شاعر توانائی بودہ و کامی تخلص میکردہ"

(نفیسی ج ا ص ۴۳۳) "امیر علاء الدولہ بن یحییٰ بن عبداللطیف سیفی قزوینی حسنی متخلص بکامی از خانوادۂ معروف سادات سیفی حسنی قزوینی و پسر امیر یحییٰ قزوینی مورخ معروف قرن نہم مؤلف لب التواریخ و مختصر التواریخ ست،...... وی پس از مشکلاتی کہ بواسطۂ سنی بودن برای خانوادہ اش در قزوین پیش آمد، بہندوستان گریخت و در دربار جلال الدین اکبر مورد توجہ شد و از شاعران محترم دربار وی بود و سرانجام در ۹۸۲ درگذشت و در غزل سرائی دست داشتہ و گذشتہ از اں مؤلف کتابی ست در تذکرۂ شاعران قرن دہم و مخصوصاً شعرای دربار اکبر کہ از ۹۷۳ تا ۹۸۱ مشغول تدوین آں بودہ و نفائس المآثر نام گذاشتہ و عبدالقادر بدایونی در منتخب التواریخ فصل مہمی کہ در تذکرۂ شعرای دربار اکبر در پایان کتاب دارد از ہمیں تذکرہ گرفتہ"

(نفیسی ج ۲ ص ۷۰۶) "میر علاء الدولہ قزوینی کامی تخلص می کردہ است"

(نفیسی ج ۲ ص ۸۲۳) "میر عبد اللطیف از زندان گریخت و چندے در کوہ ہای گیلان سرگرداں بودہ از آنجا بجلال الدین اکبر متوسل شد و زد اجازہ داد بہند بردوبا برادرش میر علاء الدولہ در ۹۶۳ بہند رسید...... علاء الدولہ ظاہراً در ۹۸۲ درگذشتہ"

چونکہ علاء الدولہ اور نفائس المآثر، زیر بحث آگیا ہے اس لئے سب سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ خاکسار کے متعدد مضامین ان دونوں موضوعات پر مختلف رسالوں اور مختلف زبانوں میں عرصہ ہوا شائع ہو چکے ہیں، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

(۱) میر علاء الدولہ کامی قزوینی" اسلامک کلچر جنوری ۵۶ء ص ۳۱-۴۸ (انگریزی میں)

(۲) میر علاء الدولہ کامی قزوینی"، مجلہ علوم اسلامیہ جون ۶۰ء ص ۱۱۱-۱۲۲ (اردو میں)

(۳) "نفائس المآثر"، انڈو ایرانکا دسمبر ۶۲ء ص ۲۲-۳۶ (فارسی میں)

(۴) نفائس المآثر بحیثیت مآخذ میخانہ، معارف نومبر ۶۳ء ص ۱۶۳-۲۸۱ (اردو میں)

مندرجۂ بالا انڈو ایرانکا والا مقالہ ایران میں اتنا مقبول ہوا کہ احمد گلچین معانی نے تاریخ تذکرہ ہای فارسی (ج ۲ ص ص ۳۶۴-۳۸۵) میں تعریف کے ساتھ پورے طور پر نقل کر دیا ہے، لیکن شاید نفیسی صاحب کی نظر سے ان میں سے کوئی چیز نہیں گذری، یا انھوں نے کسی چیز کو درخور اعتنا نہ سمجھا، اور جو کچھ خود ان کا

جی چاہا انھوں نے لکھدیا، اس لئے ناظرین کی سہولت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے یہاں کچھ لکھدینا ضروری ہے،

میں مذکورۂ بالا مضامین میں نفائس المآثر کی داخلی شہادتوں کی بنا پر یہ ثابت کر چکی ہوں کہ نفائس المآثر کی تصنیف کا کام ۹۹۸ ثمان و تسعین و تسعمایہ تک جاری رہا ہے، نفائس المآثر کی تقسیم دو حصوں میں کی جا سکتی ہے، ایک شاعری کا اور دوسرا تاریخ کا، دونوں میں سے کوئی حصہ ۹۷۶ یا ۹۸۱ میں ختم نہیں ہوا،

مندرجۂ بالا بیان میں نفیسی صاحب کا یہ کہنا کہ جب ۹۶۰ میں شاہ طہماسپ کا اس خاندان پر عتاب ہوا تو عبد اللطیف گیلان کے پہاڑوں میں سرگرداں رہا، اور جلال الدین اکبر سے اجازت طلب کر کے ۹۶۳ میں عبد اللطیف کے ساتھ ہندوستان آیا، اصلیت کے خلاف ہے، کیونکہ ہمایوں جب قزوین گیا تو علاء الدولہ کے باپ امیر یحییٰ کی علمی قابلیت سے اتنا متاثر ہوا تھا کہ اس نے کہا،

نفائس المآثر (برگ ۲۲۵ (ب) علی گڑھ) "از جملہ فوائد یکہ از آمدن عراق بدست آوردم یکی ملاقات یحییٰ بود" اور خود ہمایوں کو بھی شاہ طہماسپ کے مزاج کا تجربہ ہو گیا تھا لہذا ایک فطری بات بھی تھی کہ فوراً ہمایوں کی طرف یہ خاندان رجوع ہو جاتا، چنانچہ یہی ہوا اور علاء الدولہ کے بیان کے مطابق،

نفائس المآثر (برگ ۲۲۸ (الف) علی گڑھ) "بعد از مشقت بسیار از آنجا حسب الموعود حضرت جنت آشیانی (ہمایوں) متوجہ دیار ہند شد" اس وقت تک اکبر کا زمانہ شروع نہیں ہوا تھا، اس بیان میں علاء الدولہ نے صرف واحد غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے، یعنی خود علاء الدولہ کی ذات اس میں شامل نہیں تھی،

اور نہ اب تک اس کا پتہ چل سکا ہے، کہ وہ کب ہندوستان آیا، نفیسی صاحب کی ذرہ نوازی ہے کہ وہ علاء الدولہ کو "شاعر توانا" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور اس کو "از شاعران محترم دربار وی" (اکبر) کہتے ہیں، حالانکہ اس بیچارے نے نہ کبھی اس کا دعویٰ کیا، اور نہ اس کے کلام سے کسی کو یہ اندازہ ہوتا ہے، اور نہ کوئی تاریخی شہادت ملتی ہے، البتہ اس نے مختلف مواقع پر جو تاریخیں کہی ہیں، ان کو بہت بڑی تاریخی شہادت کہا جا سکتا ہے، کیونکہ وہ اس کے چشم دید واقعات پر مبنی ہیں، اکبر کے دربار میں شعراء اور ان کے کارنامے جس معیار کو پہنچ چکے تھے، ان میں علاء الدولہ کو کوئی مقام نہیں دیا جا سکتا تھا، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود اس کی شاعری کا کوئی معمولی کارنامہ بھی (سوا جستہ جستہ اشعار، چند غزلوں اور تاریخی قطعات کے) ہم تک نہیں پہنچا، علاء الدولہ کی وفات کے متعلق نفیسی صاحب نے دوبار لکھا ہے کہ ۹۸۲ھ میں واقع ہوئی تو یہ بیان ______ قبل از مرگ واویلا ہے، اس لئے کہ ۹۹۸ تک تو وہ نفائس المآثر لکھتا رہا، اس کے بعد اس نے عرفی شاعر کی وفات کہی میخانہ (عبد النبی فخر الزمانی. تصحیح احمد گلچین معانی ص ۲۲۱)

"سیادت و نقابت پناہ میر علاء الدولہ قزوینی تاریخ فوت آں فرید زماں را چنیں پیدا کردہ و برشتۂ نظم در آوردہ،

افسوس کہ زود عرفی از عالم رفت — نادیدہ بکام دنیا از عالم رفت
چوں معنی محض بود ازاں گفت خرد — تاریخ وفات "معنی از عالم رفت"
۹۹۹

اس سے بڑا کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ ۹۹۹ تک زندہ رہا،

نفیسی صاحب کا یہ کہنا کہ منتخب التواریخ میں اکبری دربار سے متعلق شعراء کا

حصہ نفائس المآثر سے اخذ کیا گیا ہے، کافی نہیں، بلکہ مذکورہ کتاب کا ہر ہر حصہ کم و بیش اس تذکرے کا ممنون ہے،

۵۳۔ مولانا عالمی دارا بجردی (نفیسی ج ۱ ص ۱۸۱) "در ۹۷۰ درگذشت"

نفائس المآثر ورق ۱۳۴ (ب) (علی گڑھ) "در تاریخ بست و یکم رمضان سنہ ثلث و سبعین و تسعمایہ بعالم بقا انتقال کرد"

یہ اضافہ بھی درج کرنا ضروری ہے:۔

"از دو خلف صدق باقیماندہ اند کہ شرف جان اند و جان را از وجود با وجود شان صد گونہ نور و بہری حاصل است، اول میر مخدوم کہ بطبع سلیم و قریحۂ مستقیم شرف امتیاز دارد و از علوم معقول و منقول بہرہ تمام یافتہ و در بیشتر اصناف شعر و انشا و ابداع کلمات بلاغت انتما کماہی شتافتہ سفر بسیار فرمودہ و زیارت حج و اکابر نمودہ، دوم نور الہدیٰ کہ از سمائے تفوق و کمال چون نیر اعظم اجلال دارد و بصفت کمالات آراستہ است و در دار الملک شیراز بمناصب مناسب ارجمند می باشند" (نفائس المآثر)

۵۴۔ غزالی مشہدی (نفیسی ج ۱ ص ۴۱۴ - ۴۱۵) نفیسی صاحب نے اس کی کتابوں میں صرف ایک کتاب مثنوی نقش بدیع کا نام لکھا ہے، حالانکہ نفائس المآثر برگ ۱۳۶ (الف) علی گڑھ میں حسب ذیل کتابوں کے نام درج کئے ہیں:۔

"آئینہ خیال کہ خیالات بر کمال در آنجا نمودہ یکہزار بیت است، سواد اعظم کہ از اقسام و اصناف شعر در ہند ترتیب دادہ، مولانا غزالی گفت ترتیب

پچیں ہزار بیت است

نقش بدیع بروزن مخزن اسرار یک ہزار بیت است،

عاشق و معشوق۔ چہار ہزار بیت

واردات: کہ در ہدی گفتہ قریب بدہ ہزار بیت است،

مواہب، کتابیست بروزن سلسلۃ الذہب،

کتاب سنت الشعراء، قریب بدہ ہزار بیت،

منشور اتش: کتاب اسرار مکتوم وکتاب رشحات الحیات در تصوف ومراۃ الکائنات

کتابیست محتوی بربیان اخلاق، اما ظاہراً صورت اتمام نیافتہ"

نفیسی صاحب نے اس کے مدفن کے بارے میں لکھا ہے "پیکرش را در سرگنج بخاک سپردہ اند" یہ لفظ دراصل سرکیج ہے، سادہ کتابت میں تو زیادہ فرق نہیں پڑتا، لیکن مادۂ تاریخ میں اگر اس طرح کی غلطی ہو جائے تو سنوات میں فرق پڑ جاتا ہے، چنانچہ قاسم ارسلان نے غزالی مشہدی کی تاریخ میں کہا تھا،

بعد یک سال سال تاریخش   احمد آباد و خاک سرکیج است

منتخب التواریخ (ج ۳ ص ۱۷۰-۱۷۲) میں سر کیج ہی چھپ گیا ہے یا لکھا گیا ہے، (۹۸۰ھ - ۹۸۰ھ)

اور انگریز مترجم (ج ۳ ص ۲۴۱) کچھ اپنی اور کچھ منتخب التواریخ کی غلطی سے صحیح تاریخ نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکا، (باقی)

بزم مملوکیہ

ہندوستان کے غلام سلاطین اُن کے امراء اور اس دور کے علماء، ادباء، شعراء کے علمی وادبی کارناموں پر تبصرہ، مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، قیمت ۹۵-۱۰

اقبال اور نٹشے

از جناب جگن ناتھ آزاد صاحب کشمیر

مغربی مفکرین میں نٹشے کا اثر کلام اقبال پر بظاہر بہت نمایاں نظر آتا ہے، اور اقبال کے نقادوں نے اس اثر کا ذکر اکثر اپنی تحریروں میں کیا ہے، نٹشے کے افکار کے اثر کے علاوہ جن کی جھلک جابجا کلام اقبال میں نظر آتی ہے، اقبال نے نٹشے کا ذکر بھی اپنے کلام میں متعدد موقعوں پر کیا ہے، پیام مشرق میں نٹشے کا ذکر اس کے نام کے زیر عنوان چار بار آیا ہے، ایک بار تو شوپن ہار کے تعلق سے ؎

سوز فغانِ او بہ دلِ ہر چہ گذشت   با نوک خویش خار ز اندام او کشید
گفتش کہ سود خویش ز جیب زیاں بر آر[۱]   گل از شگافِ سینۂ زار آفرید
درمان ز درد ساز اگر خستہ تن شدی   خوگر بخار شد کہ سراپا چمن شدی

ایک اور قطعہ یہ ہے،

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز   در نئے کلکش غریو تندر است
آں کہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت   قلبِ او مومن دماغش کافر است[۲]

---

۱ اے متاعِ درد در بازارِ جان انداختہ   گوہرِ ہر سود در جیبِ زیاں انداختہ (عرفی)

۲ یہ مصرع اقبال نے کارل مارکس کے بارے میں بھی دہرایا ہے،

زاں کہ حق در باطلِ او مضمر است   قلبِ او مومن دماغش کافر است

خویش را در نارِ آں نمرود سوز   زانکہ بستانِ خلیل از آذر است

اس قطعے کے ساتھ ہی علامہ اقبال لکھتے ہیں،

نٹشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے، اس کا دماغ اس لئے کافر ہے
کہ وہ خدا کا منکر ہے، مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت
قریب ہیں، "قلب او مومن دماغش کافر است"

نبی کریم نے اس قسم کا جملہ امیہ بن ابی الصلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا،

"امن لسانہ وکفر قلبہ"

نٹشے (۱۸۴۴ء-۱۹۰۰ء) جس زمانے میں پیدا ہوا وہ یورپ کی اقتصادی خوشحالی
اور سیاسی عروج کا دور تھا، یورپی ممالک ایشیا اور افریقہ میں نئے نئے ممالک پر قابض
ہو رہے تھے، اور ان دونوں براعظموں کی دولت سے اپنے خزانے بھر رہے تھے لیکن
اس خوشحالی کے ساتھ یورپ کا صنعتی انقلاب سارے یورپ کے لئے نئے نئے مسائل
بھی لے آیا، کارخانوں کے قیام کی بدولت بھاری تعداد میں آبادیاں ایک جگہ سے
دوسری جگہ منتقل ہوئیں، اس صورت حال نے زندگی کی ہم آہنگی اور انضباط
کو درہم برہم کر دیا، نٹشے نے اپنی تحریروں میں جگہ جگہ زندگی کے اس عدم توازن
کا ذکر کیا ہے، اور زندگی کی ان قدروں کو جو نئے حالات کے ساتھ قدم بقدم نہیں
چل سکتیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اصل میں نٹشے نے زندگی کو ایک فلسفی کے
نقطۂ نگاہ سے نہیں بلکہ ایک روشن ضمیر ہستی کی حیثیت سے دیکھا، اس نے انسان
کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے میں نظری دلیلوں اور خشک منطق سے کام نہیں
لیا، بلکہ زندگی کے توازن میں انسان کے دکھوں کا حل ڈھونڈھنے کی کوشش

کی اور بنی نوعِ انسان کے مستقبل کی بہتری کی خاطر اپنے نظریات اور اپنی
تحریروں میں خون جگر صرف کیا، اقبال نے اس کے متعلق ایک عجیب و غریب بات
دو فقروں میں لکھی ہے، اپنے اس شعر

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں   تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

میں "مجذوب فرنگی" کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:

"جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشے جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا
اور اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا"

اس حقیقت کو جاننے کے لئے کہ اقبال نے نٹشے کے کن نظریات کو قبول کیا اور کن
نظریات کو رد کیا، یہ فقرہ ایک چراغ راہ کی حیثیت رکھتا ہے، اقبال نٹشے کے
قلبی واردات کے قائل ہیں، لیکن اس کے فلسفیانہ افکار اسے جس راستے پر لے گئے
وہ اقبال کی نظر میں صحیح راستہ نہیں تھا،

اصل میں نٹشے کا فکر و نظر مابعد الطبیعات کے مسائل کو پیچھے چھوڑ کر اسے
نفسیات کی اس گہری دنیا میں لے گیا جہاں انسان اپنے اندر ہی علت العلل کی حقیقت
کا مشاہدہ کرنے کی شدت سے آرزو کرتا ہے، مادیت کے بوجھ تلے دبے ہوئے یورپ
میں نٹشے ایک حیرت انگیز شخصیت تھا، وہ اپنے وقت کا ایک صوفی تھا، روحانی کیفیات
سے لبریز، اور اسے اس کا پوری طرح احساس تھا، یہ دوسری بات ہے کہ وہ خدا کو نہیں
مانتا تھا، لیکن خدا کو نہ ماننے سے انسان کی روحانیت میں کمی تو نہیں آجاتی، آخر ہمارے
ہندوستان میں مہاتما بدھ جیسی عظیم شخصیت بھی تو گذری ہے، جس نے خدا کی ہستی کو
نظر انداز کیا، اور خود خدائی کا دعویٰ بھی نہیں کیا، لیکن وہ روحانیت کی ان بلندیوں

پر پہنچے کہ ہندوؤں نے انھیں خدا کا اوتار تسلیم کیا۔

نٹشے نے ایک ایسے مذہبی گھرانے میں جنم لیا تھا، جو نسلاً بعد نسلٍ پادریوں کا گھرانہ چلا آتا تھا، گویا تبلیغی جوش نٹشے کو وراثت میں ملا تھا، اور وہ عمر کے آخری حصہ تک ایک مبلغ رہا، یہ الگ بات ہے کہ یہ جذبۂ تبلیغ پہلے عیسائیت کے حق میں استعمال ہوا، بعد میں اس کے خلاف، ول ڈیورال لکھتا ہے کہ اگر نٹشے کے رگ و پے میں وہ اخلاقی قوت نہ ہوتی جو عیسائیت ہی کی بدولت اسے ملی تو وہ عیسائیت پر کبھی پے بہ پے حملے نہ کر سکتا تھا، یہ کتنی عجیب بات ہے کہ جس زمانے میں عیسائیت اس کے ہدفِ تنقید کا نشانہ تھی، اس کا نام ایک سنت اور مہاتما کے طور پر لیا جاتا تھا، نٹشے کی ماں ایک متقی اور پرہیزگار خاتون تھی، اور اخلاق اور مذہب کے معاملے میں سخت محتاط زندگی بسر کرتی تھی، ماں کی اس تعلیم کا نٹشے کی زندگی پر گہرا اثر پڑا، اور آخر تک وہ ایک راہب کی طرح پاکباز رہا، بقول ول ڈیورال یہ نٹشے کی طبیعت کی راہبی ہی کا نتیجہ ہے کہ اس نے اتقاء، پرہیزگاری اور اخلاق و مذہب کے مقابلے میں انتہائی محتاط زندگی بسر کرنے پر سخت حملے کئے ہیں، نہ جانے اس ناقابل اصلاح مہاتما کے دل میں گناہگار بننے کے لئے کتنی شدید تڑپ موجود رہی ہو گی"، اقبال یہاں نٹشے کے بارے میں بڑی حد تک ول ڈیورال کے ہمخیال ہیں ؎

خدنگ سینۂ گردوں ہے اسکا فکر بلند — کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اسکی — ترس رہی ہے مگر لذت گنہ کے لئے

نٹشے جس روز پیدا ہوا وہ جرمنی کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم کا جنم دن تھا، اُس کا والد شاہی خاندان کے اکثر افراد کا معلم رہ چکا تھا، اس لئے اس نے اسے اپنے

جذبۂ حب الوطنی کے لئے نیک فال سمجھا، اور اپنے بچے کا نام فریڈرک کے نام پر رکھا، نٹشے کہا کرتا تھا کہ میرے اس جنم دن کی بدولت کم سے کم ایک فائدہ مجھے ضرور حاصل رہا اور وہ یہ کہ میرے بچپن کے دنوں میں میری سالگرہ کے موقع پر ملک بھر میں خوشی منائی جاتی تھی،،

والد کی موت کے بعد نٹشے کی دیکھ بھال خانوادے کی عورتوں کے ہاتھ میں آگئی، جس کی بدولت غیر شعوری طور پر اس میں ایک نسائی لطافت اور نازک مزاجی پیدا ہونا شروع ہو گئی، سگرٹ اور شراب کا استعمال اس زمانے میں مردانہ خوبیوں میں شمار ہوتا تھا، لیکن نسائی ماحول میں پرورش پانے کے باعث نٹشے ان خوبیوں سے دور رہا، اپنے انہی طور طریقوں کی بدولت وہ اپنے ہم درس طلبہ میں ایک ننھے پادری کے طور پر مشہور ہو گیا، اکثر وہ اپنے ہم جماعتوں سے الگ جا کر خلوت میں بائبل کا مطالعہ کیا کرتا تھا، بائبل کے ساتھ اُس کے دلی لگاؤ کا یہ عالم تھا کہ جب وہ اوروں کے سامنے بائبل کی قرأت کرتا تھا، تو سننے والوں کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے، اس رقتِ قلبی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر پختہ اعتقادی کی بدولت ایک مستقل مزاجی بھی آہستہ آہستہ پرورش پا رہی تھی، ایک بار اس کے ہم درس طلبہ نے بائبل میں بیان کئے ہوئے ایک واقعے کو خلافِ اصلیت کہا تو نٹشے نے ثابت کرنے کے لئے کہ یہ واقعہ خلافِ اصلیت نہیں، جلتی ہوئی دیا سلائیاں اپنی ہتھیلی پر رکھ دیں، یہ واقعہ اُس کے لڑکپن کا ہے، لیکن اپنے آپ کو پختہ تر کرنے کا جذبہ ساری عمر اس کے دل میں کارفرما رہا، نٹشے کے اس فلسفۂ حیات سے کہ "سخت ہو جاؤ خطرے کی زندگی بسر کرو، اچھائی کیا ہے؟ جو تم میں قوت کا احساس پیدا کرے،

برائی کیا ہے، وہ سب کچھ جو کمزوری سے حاصل ہوتا ہے" اقبال بہت متاثر ہوئے ہیں، بلکہ اسرارِ خودی کی کہانی "حکایت الماس و زغال" انھوں نے نٹشے ہی سے لی ہے، اس میں الماس زغال سے کہتا ہے،

پیکرم از پختگی ذو النور شد | سینہ ہا از جلوہ ام معمور شد
خوار گشتی از وجودِ خامِ خویش | سوختی از نرمیِ اندامِ خویش
فارغ از خوف و غم و وسواس باش | پختہ مثلِ سنگ شو الماس باش
می شود از وے دو عالم مستنیر | ہر کہ باشد سخت کوش و سخت گیر
مشتِ خاکے اصلِ سنگِ اسود است | کو سر از جیبِ حرم بیروں زد است
رتبہ اش از طور بالاتر شد است | بوسہ گاہ اسود و احمر شد است
در صلابت آبروئے زندگی است | ناتوانی ناکسی ناپختگی است

یہ تو خیر ایک مثال تھی، جہاں تک کلامِ اقبال کا تعلق ہے اس میں نٹشے کی سختی، صلابت اور پختگی کے نظریے کی لاتعداد مثالیں ملتی ہیں، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ اقبال نے اس نظریے کو مکمل طور پر اپنا لیا ہے تو غلط نہ ہوگا،

کہا پہاڑ کی ندی نے سنگریزے سے | فتادگی و سرافگندگی تری معراج
ترا یہ حال کہ پامال و دردمند ہے تو | مری یہ شان کہ دریا بھی ہے مرا محتاج
جہاں میں تو کسی دیوار سے نہ ٹکرایا | کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

فولاد کہاں رہتا ہے شمشیر کے لائق | پیدا ہو اگر اسکی طبیعت میں حریری
جو سختیِ منزل کو سامانِ سفر سمجھے | اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی

اوچھی جس کی لہر نہیں ہے وہ کیا دریا | جس کی ہوائیں تند نہیں ہیں وہ کیا طوفاں

جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا | لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

محبت مجھے ان جوانوں سے ہے | ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

جوشِ کردار سے شمشیرِ سکندر کا طلوع | کوہِ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سلطانی کے گنبد پر | تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام | سخت کوشی سے ہے تلخِ زندگانی انگبیں

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے | اگر کانٹے میں ہو خوئے حریری

نٹشے کا یہ فلسفۂ صلابت و پختگی اقبال نے خراباتِ فرنگ میں جس خوبصورتی سے بیان کیا ہے، اس کی مثال کلامِ اقبال کے سوا اور کہیں ملنا دشوار ہے، اقبال کا کمالِ فن ان کی ڈرامائی اور مکالماتی نظموں میں اپنے انتہائی عروج پر نظر آتا ہے، یہ چند اشعار بھی انہیں نظموں کے ذیل میں آتے ہیں، اقبال مکالمے کے ذریعے سے اپنے حسنِ بیان کو کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، اس نظم میں اقبال نے صرف نٹشے کا فلسفۂ خواہشِ اقتدار ہی نہیں بیان کیا بلکہ چونکہ یہ نظریہ مذہب اور اخلاقیات کی نفی کرتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال نٹشے سے الگ اپنا راستہ اختیار کرتے ہیں، اس لئے انھوں نے اس پر نظریاتی ضرب کاری بھی لگائی ہے اور طنزیہ انداز اختیار کرکے اس مغربی سیاست کا جس کی بنیاد میکاولی اور نٹشے کے نظریات پر ہے کھوکھلا پن بھی ظاہر کیا ہے،

دوش رفتم بہ تماشائے خراباتِ فرنگ | شوخ گفتارِ رندے دلم از دست ربود
گفت ایں نیست کلیسا کہ بیابی دروے | صحبتِ دخترکِ زہرہ وش و نائے و سرود
ایں خراباتِ فرنگ است و ز تاثیرِ مئش | آنچہ مذموم شمارند نماید محمود
نیک و بد را بہ ترازوئے دگر سنجیدیم | چشمہ داشت ترازوئے نصاریٰ و یہود
خوب زشت است اگر پنجۂ گیرات شکست | زشت خوب است اگر تاب و توانِ تو فزود

تو اگر در نگری جز به ریا نیست حیات — ہر کہ اندر گرو صدق و صفا بود نہ بود
دعویٰ صدق و صفا پردہ ناموس و ریاست — پیر ما گفت پس از سیم بباید اندود
فاش گفتم بہ تو اسرار نہاں خانۂ زیست — با کسے باز مگو تا کہ بیابی مقصود

اس نظم کے حاشیہ میں علامہ اقبال نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے، کہ رند سے مراد نٹشے ہے،

بائبل اور عیسائیت میں نٹشے کی پختہ اعتقادی زندگی کے اس عدم توازن کی تاب نہ لا سکی، جو اسکی آنکھوں کے سامنے موجود تھا، اور آخر عقائد کا یہ شیشہ اپنے دور کے حالات سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا، اس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی کہ خدا اور عیسائیت دونوں سے اس کا اعتقاد اٹھ گیا، اور اس کے بعد اس کی ساری زندگی ایک ایسے خدا کو تراشنے میں صرف ہو گئی، جس پر وہ ایمان لا سکے، کہنے کو تو اس نے کہہ دیا، کہ خدا سے اس کا اعتقاد اٹھ گیا ہے، لیکن دراصل یہ اُس کی خود فریبی تھی، اٹھارہ سال کی عمر تک جب کہ دل و دماغ پر عقیدے کے نقوش بہت گہرے ہوتے ہیں، اس نے عیسائیت کو اپنی روح کی گہرائیوں میں بسایا تھا، اور اب وہ عیسائیت ہی سے منحرف ہو چکا تھا، اس انحراف کے بعد اس کی حالت ایک ایسے جواری کی سی تھی، جو اپنا سب کچھ ایک ہی داؤں پر لگا کر بازی ہار چکا ہو، مذہب اس کی زندگی کے سانچے میں رچا بسا ہوا تھا، اور جب مذہب ہی اس کی زندگی سے خارج ہو گیا، تو زندگی کے اس سانچے میں ایک لا تنا ہی خلا پیدا ہو گیا، اس خلا کو اس نے ہر ممکن طریقے سے پُر کرنے کی کوشش کی، کبھی بحث و مباحثہ سے، اور کبھی سگرٹ اور شراب کے استعمال سے، لیکن سگرٹ

اور شراب سے وہ بہت جلد بیزار ہو گیا، کیونکہ اُن کے بارہ میں اس کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ سگرٹ اور شراب کے استعمال سے انسان کے ادراک میں حس لطیف باقی نہیں رہتی، اور وہ گہرے سوچ بچار کے قابل نہیں رہتا،

جن حالات کے مشاہدے نے نٹشے کو عیسائیت سے بیزار کر دیا تھا، اس سے اس کی بیزاری کا اندازہ لگانا دشوار نہیں، عیسائیت اپنے ساتھ اس کی دلی تسکین کے اسباب بھی لیتی گئی، اور اب اس کے لئے کسی شئے یا کسی فرد میں تسکین کا پہلو باقی نہیں رہ گیا تھا، فکری اعتبار سے اب ایک تنہائی کے سوا اس کا کوئی رفیق نہیں تھا، نٹشے کے لئے یہ ایک ذہنی کشمکش کا دور تھا، اور اس ذہنی کشمکش کے بارہ میں اس نے لکھا:۔

”میں اس وقت ایک سخت مسئلے سے دوچار ہوں، مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک گھنے جنگل میں بھٹک رہا ہوں، کاش میرے کچھ مرید ہوتے، کاش میرا کوئی مرشد ہوتا“

لیکن اسے نہ کوئی مرید مل سکا نہ پیر، انیسویں صدی اس کے نزدیک ہر اعتبار سے ایک سپاٹ اور اجاڑ زمانہ تھا، اگرچہ بعض دوسرے مفکروں کی نظر میں یہ دور ایک رجائی اور ترقی پسند دور تھا، لیکن نٹشے اسے منکر مذہب و اخلاق قرار دے کر اس پر پے بہ پے حملے کر رہا تھا اور اس کی شکست و ریخت میں مصروف تھا،

خدا کے بارے میں اس کے اس نظریئے نے کہ خدا مر چکا ہے اسے نئے خدا کی تخلیق پر مجبور کیا، وہ اپنی ایک تصنیف میں ایک کردار کے منہ سے کہلواتا ہے، کیا ہم خود خدا نہیں بن سکتے، اتنا عظیم کارنامہ اس سے قبل ظہور پذیر نہیں ہوا، اگر یہ کارنامہ انجام پا جائے تو ہمارے بعد آنے والے اپنے آپ کو تاریخ کے ایک اعلیٰ اور ارفع دور میں

پائیں گے، ایسا دور آج تک صفحۂ کائنات پر رونما نہیں ہوا ہوگا۔" یہ اصل میں فوق البشر کا تصور تھا جو نٹشے پیش کر رہا تھا، اِسے اہم تلاش حقیقت کی کوشش کہیں یا حقیقت سے فرار کی، لیکن نٹشے فوق البشر کے تصور سے اپنے اُس خلاء کو پُر کر رہا تھا، جو خدا کو نہ ماننے سے اس کی زندگی میں پیدا ہو گیا تھا۔

از سُستیٔ عناصرِ انسان دلش تپید　　فکرِ حکیم پیکرِ محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوبِ تازہ ئ　　دیوانہ بکارگہِ شیشہ گر رسید

جب ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس میں جنگ چھڑی تو نٹشے نے اپنے ملک کی آواز پر لبیک کہا اور بھرتی ہونے کے لئے محاذِ جنگ پر روانہ ہو گیا، رستے میں ترسک نمٹ کے مقام پر اس نے فوج کے ایک دستے کو دیکھا اور اِس نتیجے پر پہونچا کہ "زندگی کی تمنا سے مراد یہ نہیں کہ انسان محض زندہ رہنے کے لئے خستہ حالی کے ساتھ جدوجہد کرتا رہے، بلکہ اس کے دل میں جنگ کرنے کی قوت حاصل کرنے کی اور غلبہ پانے کی تمنا پیدا رہو۔" نٹشے کی نظر کمزور تھی، اس لئے وہ فوج میں بھرتی نہ ہو سکا، چنانچہ اسے نرسنگ کے کام پر لگا دیا گیا، فکری اعتبار سے جنگ کی تلقین کرنے والے فلسفی نے میدانِ جنگ کی قیامت خیزیاں کہاں دیکھی تھیں، زخمی سپاہیوں کی حالت زار دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی، زخموں سے رستا لہو وہ زیادہ دیر تک نہ دیکھ سکا، اور بیمار پڑ گیا اور اسی حالت میں اسے واپس گھر بھجوا دیا گیا۔[1]

---

[1] جاوید اقبال اپنے ایک مضمون "ابا جان" میں لکھتے ہیں: "ابا جان کی بڑی تمنا یہ تھی کہ میں تقریر کرنا سیکھوں، وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں کشتی لڑا کروں، اس سلسلے میں میرے لئے گھر میں ایک اکھاڑہ بھی کھدوا دیا گیا تھا، وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس اکھاڑے کی مٹی پر ڈنڑ پیلنا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۵ پر)

عیسائیت سے بیزار ہونے کے بعد نٹشے کسی سیاسی یا نیم سرکاری نظامِ حیات کے دامن میں پناہ نہ لے سکا، جمہوری یا اشتراکی نظام اس کے لئے تسکینِ دل کا سامان مہیا نہ کر سکے، یہاں بھی اقبال نٹشے کے ہمنوا ہیں، جمہوریت کے بارے میں علامہ کہتے ہیں،

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی　　ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو　　کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

"ضربِ کلیم" میں اگرچہ علامہ نے یہ قطعہ اسٹنڈل کے حوالے سے لکھا ہے،

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش　　ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

لیکن جمہوریت کے بارے میں نٹشے نے بھی قریب قریب یہی الفاظ استعمال کئے ہیں،[1] نٹشے کے سامنے جتنے بھی سیاسی نظام تھے، اس کے نزدیک انسانی مسائل میں اضافے کا سبب تھے، نہ کہ مسائلِ زندگی کا حل، اس کی نظر میں اس کے زمانے کی ایک عام

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۳۴) یا لنگوٹی باندھ کر لیٹ رہنا صحت کے لئے نہایت مفید ہے، پھر بڑی عید کے روز ہمیشہ مجھے تلقین کیا کرتے تھے، کہ بکری کے ذبح ہونے کے وقت میں وہاں موجود رہوں، لیکن ان کا اپنا یہ حال تھا کہ کسی قسم کا خون بہتے نہ دیکھ سکتے تھے، ایک دفعہ دالان میں مجھے جو کھیلتے ٹھوکر لگی تو منہ کے بل گرا میرا نچلا ہونٹ اندر سے کٹ گیا، ابا جان اتفاق سے اُدھر آنکلے اور میرے منہ سے خون بہتا دیکھ کر بجائے اسکے کہ میرے قریب پہونچیں یا مجھ سے پوچھیں کیا ہوا ہے، وہ چند لمحوں کے لئے ساکت و مبہوت کھڑے رہے پھر ان کے قدم ڈگمگائے اور وہ بے ہوش ہو کر وہیں گر پڑے، جب ہوش آنے پر انھیں بتایا گیا کہ معمولی چوٹ تھی اور اب میں ٹھیک ہوں تو بڑے متعجب ہوئے، کہنے لگے "اس کے منہ سے تو خون کے فوارے چھوٹ رہے تھے"

[1] جمہوریت افراد کو گننے کی ایک میزان ہے۔ (نٹشے)

خاصیت یہ تھی کہ انسان اپنی نظر میں بے وقار ہو کر رہ گیا ہے، انسان کے وقار کو دوبارہ بحال کرنے کا ذریعہ اس کے سامنے صرف فوق البشر تھا، اور فوق البشر کی سب سے بڑی خاصیتیں نٹشے کے نزدیک تخلیق آرزو اور قوت ارادی ہیں، گویا یہاں تک نٹشے کے فوق البشر اور اقبال کے مرد مومن میں بڑی مطابقت ہے،

افلاک سے ہے اس کی حریفانہ کشاکش | خاکی ہے مگر خاک سے آزاد ہے مومن
جچتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں | جبریل و اسرافیل کا صیاد ہے مومن

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

آں مسلمانے کہ بیند خویش را | از جہانے برگزیند خویش را
از ضمیر کائنات آگاہ اوست | تیغ لا موجود الا اللہ اوست
بحثی از ہانگے کہ برخیزد زجاں | نے ز نور آفتاب خاوراں
فطرت او بے جہات اندر جہات | او حریم و در طواف کائنات

وجود شعلہ از سوز درون است | چو خس او را جہان چند چون است
کند شرح انا الحق ہمت او | پئے ہر کن کہ می گوید یکون است

لیکن نٹشے ضابطۂ حیات کے لئے طاقت کو بنیاد قرار دیتا ہے نہ کہ شفقت و کرم کو وہ یہ بھی کہتا ہے کہ فوق البشر کی تخلیق کے لئے ضروری ہے کہ بہترین افراد، بہترین افراد ہی کے ساتھ شادی کریں، یہ گویا نسلی امتیاز پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے، یہاں اقبال کا نظریہ نٹشے سے مختلف ہو جاتا ہے، کیونکہ اقبال کے نزدیک نسلی امتیاز غیر اسلامی اور غیر انسانی ہے۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

(بانگ درا)

"بقول زردشت" میں نٹشے نے انسان کو ظالم ترین جانور کہا ہے، لیکن اقبال کا مرد مومن قوت و جبروت اور شفقت و کرم کا امتزاج ہے،

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم | دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

پیش باطل تیغ و پیش حق سپر | امر و نہی او عیار خیر و شر
عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم | ہم بہ قہر اندر مزاج او کریم

نٹشے کا فوق البشر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے، وہ جبر اور تشدد کا مجموعہ ہے، اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے، لیکن اقبال کا مرد مومن توحید پرست بھی ہے اور انسان دوست بھی،

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ | سایۂ شمشیر میں اس کی پنہ لا الٰہ
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات | ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل | اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو | رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

آدمیت احترام آدمی | باخبر شد از مقام آدمی

نٹشے کا فوق البشر جہاں خودی سے آگاہ ہے، وہاں اقبال کا مرد مومن خودی کے ساتھ بیخودی کا بھی رمز شناس ہے، گویا اقبال جہاں نٹشے کے قلبی واردات کے قائل ہیں وہاں اُس کے فلسفیانہ افکار کے قائل نہیں، اُس کی غیب دانی، روشن ضمیری اور غیر معمولی بصیرت کی بنا پر اقبال نے اسے مجذوب اور حلاج کہا ہے اور اسی وجہ سے "جاوید نامہ" میں نٹشے کو مادی اور روحانی جہانوں کے درمیان —— آں سوے افلاک —— ہی دکھایا ہے، مادی دنیا نٹشے کا مقام اس لئے نہ بن سکی کہ اس کا قلب مومن ہے اور

روحانی دنیا کے قابل وہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ اس کا دماغ کافر ہے۔[1]

مطالعۂ کلامِ اقبال سے معلوم یہ ہوتا ہے، کہ اقبال کو نٹشے کی تحریروں کے ذریعے سے اس کی ذات کے ساتھ ایک خاص تعلقِ خاطر پیدا ہو گیا تھا اور انھیں نٹشے کے الحاد سے

---

[1] جہاں تک اقبال کے نظریۂ مردِ مومن کا تعلق ہے، عام خیال یہ ہے کہ اقبال نے یہ نظریہ نٹشے کے نظریۂ فوق البشر سے مستعار لیا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے مردِ مومن اور نٹشے فوق البشر میں کسی حد تک مماثلت کے پہلو موجود ہیں، لیکن دونوں میں عدم مماثلت کے پہلو مماثلت کے پہلوؤں سے کہیں زیادہ ہیں، میں نے سطورِ بالا میں دونوں پہلوؤں کی کسی حد تک نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس ضمن میں علامہ اقبال کی اپنی ایک تحریر پر نظر ڈالنا اس موضوع کے مطالعے کے لئے ناگزیر ہے،

جس زمانہ میں ڈاکٹر نکلسن نے "اسرارِ خودی" کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، ــــ اور غالباً ۱۹۲۱ء کی بات ہے ــــ بعض انگریز نقادوں نے اپنے مقالات میں علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کو موضوعِ بحث بنایا تھا اور انھوں نے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا کہ اقبال کا تصورِ مردِ مومن نٹشے کے تصورِ فوق البشر کی صدائے بازگشت ہے، اقبال نے اس سلسلہ میں ڈاکٹر جانسن نکلسن کے نام اپنے ایک خط میں لکھا تھا: "مجھے یہ معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی کہ اسرارِ خودی کا ترجمہ انگلستان میں قبولِ عام حاصل کر رہا ہے، بعض انگریز تنقید نگاروں نے اس سطحی تشابہ اور تماثل سے جو میرے اور نٹشے کے خیالات میں پایا جاتا ہے، دھوکا کھایا ہے، اور غلط راہ پر پڑ گئے ہیں، "دی نیشن" والے مضمون میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں وہ بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں، لیکن اس غلطی کی ذمہ داری صاحبِ مضمون پر عائد نہیں ہوتی، وہ اپنی لاعلمی کی بنا پر معذور ہے، اس نے اپنے مضمون میں میری جن نظموں کا ذکر کیا ہے، اگر اسے اُن کی (بقیہ حاشیہ ص ۴۳۹ پر)

سے دلی دکھ ہی نہیں ہوتا تھا، بلکہ وہ اس بات کی حسرت کرتے تھے، کہ کاش نٹشے کو شیخ احمد سرہندی ایسا کوئی رہنمائے کامل جاتا جو اس کے فلسفیانہ افکار کو سیدھے راستے پر ڈال دیتا،

بر تغور ایں جہانے چون و چند ۔۔۔ بود مردے باصدائے دردمند

(بقیہ حاشیہ ص ۴۳۸) صحیح تاریخِ اشاعت کا بھی علم ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ میری ادبی سرگرمیوں کے نشو و ارتقاء کے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف نظر آتا،

وہ انسانِ کامل کے متعلق میرے تخیل کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا، یہی وجہ ہے کہ اس نے خلط مبحث کر کے میرے انسانِ کامل اور جرمن مفکر کے فوق الانسان کو ایک ہی چیز فرض کر لیا ہے میں نے آج سے تقریباً بیس سال قبل انسانِ کامل کے صوفیانہ عقیدے پر قلم اٹھایا تھا، اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ نہ تو نٹشے کے عقاید کا غلغلہ میرے کانوں تک پہنچا تھا، اور نہ اس کی کتابیں میری نظر سے گذری تھیں، ...... نٹشے بقائے شخصی کا منکر ہے، جو لوگ حصولِ بقا کے آرزو مند ہیں وہ ان سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ کے لئے زمانے کی پشت کا بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو؟" اس کے قلم سے یہ الفاظ اس لئے نکلے ہیں کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا، اس نے کبھی مسئلۂ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاعِ گراں مایہ ہے، جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صورِ اشکالِ مختلفہ کو جن میں "تصادمِ پیکار" بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں، اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے، چنانچہ اسی خیال کے پیشِ نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو مردود قرار دیا ہے، میں تصادم کو سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں حالانکہ اس باب میں نٹشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے" (ترجمہ مکتوب علامہ اقبال از عبد الرحمٰن طارق)

دیدۂ او از عقابان تیز تر — طلعت او شاہد سوز جگر

دمبدم سوز درون او فزود — بر لبش بیتے کہ صد بارش سرود

"نہ جبریلے نہ فردوسے نہ حورے نے خداوندے

کف خاکے کہ می سوزد ز جان آرزو مندے"

قاری کے لئے نٹشے کی آتش دل کا بیان ان الفاظ میں کرنے کے بعد وہ رومی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

من بہ رومی گفتم این دیوانہ کیست — گفت این فرزانۂ المانوی است

در میان این دو عالم جائے اوست — نغمۂ دیرینہ اواز نائے اوست

باز این حلاج بے دار و رسن — نوع دیگر گفتہ آں حرف کہن

حرف او بے باک و افکارش عظیم — غربیاں از تیغ گفتارش دونیم

نٹشے کو "حلاج بے دار و رسن" کہہ کے اقبال نے نٹشے کے نظریۂ فوق البشر کو دو حرفوں میں سمیٹ لیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اقبال رومی سے پوچھتے ہیں یہ دیوانہ کون ہے، رومی اقبال کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دیوانہ نہیں ہے، بلکہ جرمنی کا مفکر ہے، اور اس کا مقام انہی دونوں عالموں کے درمیان ہے، اس کی بانسری[1] میں نغمۂ دیرینہ موجود ہے، اس "حلاج بے دار و رسن" نے حرف کہن کو دوسرے انداز سے بیان کیا ہے[2]

---

[1] نائے حلق کو بھی کہتے ہیں، [2] یہاں اس نکتے کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ حلاج نے جب انا الحق کہا تھا تو اس نے رنائے مقید کو حق (خدا) قرار دیا تھا، نٹشے نے بھی ایک طرح سے انا الحق ہی کہا، لیکن اس کے کہنے کا طریقہ مختلف تھا، یعنی اس نے رنائے مقید کو فوق البشر کا نام دیا تھا،

اس نے جو کچھ کہا بڑی بے باکی سے کہا، اس کے خیالات عظیم ہیں، اہل مغرب اس کی گفتار با تیغ تنقید سے دو ٹکڑے ہو چکے ہیں[1]:

با تجلی ہمکنار و بے خبر — دور تر چوں میوہ از بیخ شجر

چشم او جز رویت آدم نخواست — نعرہ بے باکانہ زد آدم کجاست

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود — مثل موسیٰ طالب دیدار بود

کاش بودے در زمان احمدے — تا رسیدے بر مقام سرمدے

فوق البشر کے علاوہ ایک اور اہم موضوع جس کے بارے میں اقبال اور نٹشے کے خیالات کا ذکر کرنا ضروری ہے "عورت" ہے، عورت کے متعلق اقبال یہاں تک، تو نٹشے کے ہم خیال ہیں کہ مرد اور عورت میں مساوات کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن وہ نٹشے کی طرح یہ نہیں کہتے کہ عورت مرد کے لئے ایک خطرناک کھلونا ہے نہ ہی وہ نٹشے کی طرح یہ کہتے ہیں کہ مرد کی تعلیم جنگی ماحول کے پیش نظر ہونا چاہیئے اور عورت کی مرد کے دل بہلاوے کے پیش نظر" بلکہ وہ اس نظریئے کی صاف مخالفت کرتے ہیں۔ ؎

بہل اے دخترک این دلبری ہا — مسلماں را نہ زیبد کافری ہا

منہ بر دل جمال غازہ پرورد — بیا موز از نگہ غارت گری ہا

جہاں را محکمی از امہات است — نہاد شاں امین ممکنات است

اگر این نکتہ را قومے نداند — نظام کار و بارش بے ثبات است

---

[1] نٹشے نے مسیحی فلسفۂ اخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے (اقبال)

خدا اور مذہب سے بیزار ہو جانے کے بعد اس نے بڑی بے باکی کے ساتھ اپنے آبائی مذہب پر تنقید کی،

طینتِ پاک تو ما را رحمت است　　قوت و دین اساسِ ملت است

می تراشد فکر ما طرزِ اداے ما　　فکر ما، گفتار ما، کردار ما

جہاں نطشے نے کہا ہے کہ عورت مرد کے لئے ایک خطرناک کھلونا ہے، وہاں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ مرد عورت کے لئے بچہ پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے، گویا نطشے مرد اور عورت کے تعلقات کو ایک حیاتیاتی تعلق سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا، اقبال اس تعلق کو ایک اعلیٰ سماجی اور روحانی سطح پر لے جاتے ہیں اور اُن کے خیال میں،

جوہر مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر　　غیر کے ہاتھ میں ہے جوہر عورت کی نمود

راز ہے اس کے تپ غم کا یہی نکتۂ شوق　　آتشیں لذتِ تخلیق سے ہے اس کا وجود

کھلتے جاتے ہیں اسی آگ سے اسرارِ حیات　　گرم اسی آگ سے ہے معرکۂ بود و نبود

نطشے اور اقبال کے خیالات کی مماثلت اور عدم مماثلت کی ایک ہلکی سی جھلک ان سطور میں پیش کی گئی ہے یہ اقبال کے نطشے کے ساتھ فکری رشتے اور تعلق خاطر کی ایک جامع تصویر نہیں ہے، جیسا کہ اس مقالے کے زیرِ نظر حصے کی ابتدا میں ذکر کیا جا چکا ہے، اقبال نطشے کے اکثر نظریات کو رد کرنے کے باوجود اسکی شخصیت سے بھی بیحد متاثر ہیں، اور اسکی تحریروں سے بھی، نطشے کی شاعرانہ تحریروں کے اکثر حصوں کا علامہ نے بڑا گہرا اثر قبول کیا ہے، اور انہیں اپنے کلام میں ایک نئے حسن کے ساتھ اور اپنے نظریے کے تحت پیش کیا ہے، اسکی دو ایک مثالیں یہ ہیں:-

میرا زمانہ ابھی نہیں آیا، کل کے بعد جو دن آئے گا وہ میرا ہے،　　(نطشے)

من نواے شاعرِ فردا استم　　(اقبال)

انسان کامل نسلوں کے انتخاب اور تیاریوں کے بعد منصۂ شہود پر آتا ہے، آج ایک شخص جس صورت میں ہمارے سامنے ہے، اس میں اس کے آبا و اجداد

کا لہو صرف ہو چکا ہے،　　(نطشے)

عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات　　تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں　　(اقبال)

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا　　(اقبال)

مدتوں تک ہم اس شخصیت کے اجزا اور ٹکڑے بن کر رہے ہیں جو ایک مکمل شخصیت اور مکمل نظام کہلائی جا سکتی ہے،　　(نطشے)

بود و نبودِ ماست ز یک جلوۂ صفات　　از لذتِ خودی چو شرر پارہ پارہ ایم　　(اقبال)

صرف وہ شخص جو میری تحریروں کے ماحول میں سانس لینا جانتا ہے اس حقیقت سے آشنا ہے، کہ یہ ماحول بلندیوں کا ماحول ہے، یہ ایک ہمہ گیر ماحول ہے، میرے قاری کو اس کے مطابق ہونا چاہئے، ورنہ اس بات کا امکان ہے کہ یہ ماحول اسے ہلاک کر دے گا،　　(نطشے)

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ　　کہ نکتہ ہاے خودی ہیں مثالِ تیغِ اصیل　　(اقبال)

جمہوریت ——— افراد کو گننے کا ایک جنون　　(نطشے)

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی　　ز موراں شوخیِ طبعِ سلیمانے نمی آید

گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو　　کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید　　(اقبال)

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش　　ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے　　(اقبال)

"خطرے کی زندگی بسر کرو، اپنی بستیاں آتش فشاں پہاڑ ویسوویس کے اس پار بساؤ، اپنے جہازوں کو ان سمندروں میں بھیجو جو ابتک بنی نوع انسان کی رسائی سے دور ہیں"(نطشے)

بکیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است | سفر بہ کعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است (اقبال)

گر بہ خود محکم شوی سیلِ بلا انگیز چیست | مثلِ گوہر در دلِ دریا نشستن می تواں (")

رفیقش گفت اے یارِ خردمند | اگر خواہی حیات اندر خطر زی

دمادم خویشتن را بر فساں زن | ز تیغِ پاک گوہر تیز تر زی

خطر تاب و تواں را امتحان است | عیارِ ممکناتِ جسم و جان است (اقبال)

(سے نٹشے کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ آرٹ لوگوں میں صلابت کے عوض نرمی پید اکر دیگا (ول ڈیورانٹ)

من آں علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم | کہ از تیغ و سناں بیگانہ سازد مردِ غازی را (اقبال)

علامہ نے نٹشے کے ان نظریات کو جس طرح اپنی ترمیم اور اضافے کے ساتھ لباس شعر پہنایا وہ صرف ان کی فکری عظمت کی نہیں بلکہ شاعرانہ عظمت کی بھی دلیل ہے۔ یہ کہنا کہ اس قسم کی مثالوں سے علامہ کی شاعرانہ عظمت پر حرف آتا ہے صحت مندانہ انداز سے نہیں بلکہ مریضانہ انداز سے سوچنے کا نتیجہ ہے۔ عظیم فکری شخصیتیں ہمیشہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ فوق البشر کا نظریہ ہو یا خودی کا، تاریخ فکر انسانی میں یہ کسی نہ کسی انداز میں ہر دور میں مل جائے گا۔ گیتا میں بھگوان کرشن کا صیغہ واحد متکلم اسی خودی ہی کا ایک پرتو ہے، اپنے اپدیش کے ذریعہ کرشن جس طرح ارجن کے تنِ مردہ میں نئی جان ڈالتے ہیں، اسے اقبال نے اس مصرعہ میں بیان کیا جا سکتا ہے

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہی مردِ مومن یا مردِ کامل رامائن اور مہابھارت کے زمانہ میں بھی موجود ہے اور رومی کے یہاں بھی ہے، کارلائل کے یہاں یہ ہیرو کہلاتا ہے، اور شوپن ہار کے یہاں "جینیس" اقبال کے یہاں یہ مردِ مومن بھی ہے، انسانِ کامل بھی اور دانائے راز بھی۔

حضرت علیؓ کے کلام

سے

ادبائے عرب کا استفادہ

از

جناب سید محمود حسن قیصر امروہوی ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۳)

۱۸) یا ابن آدم! ماکسبت فوق قوتک، فانت فیہ خازن لغیرک[۱] | اے آدم کے بیٹے! اپنے خرچ سے زائد جو کچھ تو نے حاصل کیا ہے، اس میں تو اپنے غیر کا خازن ہے۔

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

مالی اراک الدھر تجمع دائباً | البعل عرسک لا اباً لک تجمع

میں ہمیشہ تجھ کو جمع کرتا ہوا دیکھتا ہوں، تیرا باپ مر جائے کیا تو اپنی دلہن کے شوہر کے لئے جمع کرتا ہے۔

۱۹) لا یزھدنک فی المعروف، من لا یشکر لک فقد یشکرک علیہ من | ناشکرے کی ناشکری تجھ کو نیکی سے نہ روکے، کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس

---

[۱] نہج البلاغۃ (۳) : ۱۹۶ رقم ۱۹۲ شرح ابن ابی الحدید (۱۹-۱۰)

لا یستمتع بشیئ منہ، وقد — نیکی پر وہ شخص تیرا شکر مند ہو، جس کو

تدرک من شکر الشاکر اکثر — اس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو، اور

مما اضاع الکافر[1] — کبھی کبھی شکر کرنے والے کے شکر سے

اس سے کہیں زیادہ مل جاتا ہے جو کافر

نعمت نے ضائع کیا ہے،

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ نے یہ قول حسب ذیل دو شعروں میں نقل کیا ہے، جو انہوں نے اسی قول کے تحت نقل کئے ہیں[2]:۔

لا تسدین الی ذی اللوم مکرمۃ — فانہ سبخ لا ینبت الشجرا

فان زرعت فمحفوظ بمضیعۃ — واکل زرعک شکر الغیران کفرا

کمینے کے ساتھ کوئی نیکی نہ کرو، اس لئے کہ وہ ایک بنجر زمین ہے جو پیڑ نہیں اگا سکتی لیکن اگر تم نے اس میں تخم ریزی کر ہی دی ہے تو وہ زمین میں محفوظ ہے، پس اگر اس نے ناشکری کی ہے، تو غیر کا شکر تیری کھیتی کی سر سبزی ہے،

(۲۰) فلا تحمل ھم سنتک علی — اپنے سال کا غم، اپنے دن پر مت لادو،

ھم یومک، یکفاک کل یوم — اسلئے کہ ہر دن، تم جس حالت میں ہو

علی ما فیہ فان تکن السنۃ — وہ کافی ہے، پس اگر سال تمہاری

من عمرک، فان اللہ تعالی — عمر میں ہے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر نئے

سیؤتیک فی کل غد جدید — کل کے لئے تم کو تمہارا حصہ دے گا،

[1] نہج (۳: ۱۹۹، رقم ۲۰۴) [2] شرح ابن ابی الحدید (۱۹ : ۴۴) [3] نہج البلاغۃ (۳ : ۲۳۵، رقم ۲۷۹) عیون الاخبار (۳ : ۲۷۱)

یہ مضمون نابغہ شیبانی متوفی ۱۲۵ھ نے اس طرح نظم کیا ہے[1]:

ولست بخائف ابدا طعاما — حذار غد لکل غد طعام

میں کل کے خوف سے کسی طرح بھی کسی کھانے سے محروم ہونے والا نہیں ہوں، اس لئے کہ ہر کل کے لئے کھانا مقدر ہے،

(۲۱) قلیل تدوم علیہ، ارجی — کم مگر مسلسل، اس عمل کثیر سے زیادہ ہے

من کثیر مملول منہ[2] — جو تھکا دینے والا ہو،

یہ مضمون ایک شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے[3]،

انی لکثرت علیہ فی زیارتہ — فمل والشیئ مملول اذا کثرا

ورابنی منہ انی لا ازال اری — فی طرفہ قصراً عنی اذا نظرا

میں نے زیادتی کے ساتھ اس سے ملنا شروع کر دیا، نتیجے میں دل بھر گیا، سچ ہے جب کسی چیز کی زیادتی ہوتی ہے تو دل بھر ہی جاتا ہے،

مجھے اس بات نے تعجب میں ڈال دیا کہ اب جب بھی وہ میری طرف دیکھتا ہے تو میں برابر اس کی نگاہوں میں اپنے سے بے توجہی پاتا ہوں،

(۲۲) اشعث بن قیس سے اس کے بیٹے کی وفات پر امیر المومنین نے جو کلمات تعزیت فرمائے ہیں:۔

ان صبرت صبر الاکارم — اگر شریفوں کی طرح صبر کروگے تو

[1] ابن قتیبہ: عیون الاخبار (۲ - ۱ ، ۳۷)، الکامل للمبرد (۱ : ۱۳۷) [2] نہج البلاغۃ (۳ : ۲۲۱، رقم ۲۷۸ و ۲۵۹، رقم ۴۴۴) ص ۲۵۹ پر اس کی روایت اس طرح ہے: "قلیل مدوم علیہ خیر من کثیر مملول منہ" [3] شرح ابن ابی الحدید (۲۰ : ۹۴)

وإلّا سلوت سُلُوّ البهائم[1] — بہتر ہے، ورنہ جانوروں کی طرح خاموش ہونا پڑے گا،

ابو تمام حبیب بن اوس متوفی ۲۳۱ھ نے اس قول کو حسب ذیل دو شعروں میں نظم کیا ہے[2]

وقال علی فی التعازی لاشعث — وخاف علیه بعض تلک المآثم

اتصبر للبلوی عزاءً وخشیة — فتؤجر أو تسلو سُلُوّ البهائم

(علی بن ابی طالبؓ نے اشعث سے بطور تعزیت فرمایا جب کہ آپ کو یہ خطرہ ہوا کہ اس غم میں اس سے کچھ گناہوں کا صدور ہو جائے گا۔ "مصیبت پر اگر اللہ کے خوف کے تحت صبر کرو گے تو اس کا اجر پاؤ گے، ورنہ نتیجے میں اس طرح خاموش ہونا پڑے گا، جس طرح جانور خاموش ہو جاتے ہیں۔)

۲۳) إنّ للہ عباداً یختصّهم — بےشک اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی

الله بالنعم لمنافع العباد فیقرّها — ہیں جن کو وہ بندگانِ خدا کی نفع

فی ایدیهم ما بذلوها، فاذا — رسانی کے لئے نعمتوں سے مخصوص کر دیتا

منعوها، نزعها منهم ثمّ — ہے پس جب تک وہ بذل و عطا سے

حوّلها الی غیرهم[3] — کام لیتے ہیں، اللہ ان نعمتوں کو ان کے پاس برقرار رکھتا ہے لیکن وہ جب روک لیتے ہیں تو اللہ ان نعمتوں کو ان

[illegible]

۱ نہج ۳: ۲۵۲، رقم ۴۱۴ ۲ الماوردی: ادب الدنیا والدین، ۲۲۵،

۳ نہج (۳: ۲۵۵، رقم ۴۲۵)

ایک شاعر نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے[1]

لو یعطک الله ما اعطاک من نعم — إلّا لتوسیع من یرجوک احسانا

فان منعت فاخلق ان تصادفها — تطیر عنک زرافات ووحدانا

(ترجمہ) اللہ نے تجھ کو جو نعمتیں دی ہیں، وہ صرف اس غرض سے کہ جو شخص تجھ سے بھلائی کی امید کر رہا ہے، اس پر تو کشادگی کرے۔

پس اگر تو اُن کو دینے سے باز رہے تو وہ ایک ایک اور دو دو ہو کر تیرے پاس سے اُڑ جائیں گے،

۲۴) ما لابن آدم والفخر اوّله — آدم کا بیٹا کیا فخر کر سکتا ہے، جس کا

نطفة وآخره جیفة[2] — اول نطفہ ہے اور آخر مردار،

اسی مضمون کو مشہور شاعر ابو العتاہیہ نے اس طرح نظم کیا ہے[3]

ما بال من اوله نطفة — وجیفة آخره یفخر

(ترجمہ) وہ کیا فخر کر سکتا ہے، جس کا اول نطفہ ہے اور آخر مردار،

۲۵) الحلم والاناة توأمان — حلم اور نرمی دونوں ایک دوسرے

ینتجهما علو الهمة[4] — سے جڑے ہوئے ہیں، جو بلند ہمتی سے پیدا ہوتے ہیں،

یہ مضمون مشہور شاعر ابن ہانی الاندلسی متوفی ۳۶۲ھ نے قدرے شرح کے ساتھ اس طرح نظم کیا ہے[5]

۱ شرح نہج البلاغۃ (۲۰: ۷۰) ۲ نہج (۳: ۲۶۰، رقم ۴۵۴) ۳ دیوان ابی العتاہیہ (شکری فیصل): ۵۲ ۴ نہج البلاغۃ ۲۶۲، رقم ۴۶۰ ۵ دیوان ابن ہانی: ۲۷۰،

وكل اناة في المواطن سودد — ولا كاناة من تدبر محكمٍ

ومن يتبين ان للسيف موضعاً — من الصفح يصفح عن كثير ويحلم

ہر زمی اپنے موقع پر سرداری ہے، لیکن ایسی زمی کی طرح نہیں جو غور و فکر کے بعد ہو، جس شخص پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ تلوار کے ساتھ ساتھ عفو و درگذر کا بھی ایک مقام ہے، تو بہت سی باتوں کو وہ نظر انداز کر جاتا ہے، اور حلم اختیار کرتا ہے۔

(۲۶) اغض على القذى والا لم ترض ابداً[1] — تکلیفوں سے نظر پھیر لو، ورنہ کبھی خوش نہ ہوگے۔

بشار کا شعر ہے[2]:

اذا انت لم تشرب مراراً على القذى — ظمئت واي الناس تصفو مشاربه

(ترجمہ) اگر کڑوا گھونٹ نہ پیوگے، تو پیاسے رہوگے، اور ایسا کون ہے جس کی سیرابی کے مقامات صاف ہوں

(۲۶) زهدك في راغب فيك نقصان حظ ورغبتك في زاهد فيك ذل نفس[3] — جو شخص تیری طرف راغب ہو، اس سے بچنا بے عقلی ہے، اور جو تجھ سے کھنچ رہا ہو، اس کی طرف جھکنا ذلت نفس ہے،

عباس بن احنف متوفی ۱۹۲ھ نے یہ مضمون اپنی ایک نسیب میں اس طرح نظم کیا ہے[4]:

مازلت ازهد في مودة راغب — حتى ابتليت برغبة في زاهد

[1] نہج (۳: ۲۰۱، رقم ۲۱۳) [2] دیوان بشار (۱: ۳۰۹) [3] نہج (۳: ۲۲۰، رقم ۴۵۱)
[4] شرح ابن ابی الحدید (۲۰: ۱۰۱)

هذا اهو الداء الذي ضاق به — حيل الطبيب وطال يأس العائد

(میں ہمیشہ اس شخص سے کھنچتا تھا جو میری طرف جھکتا تھا، یہاں تک کہ جو مجھ سے کھنچتا تھا اس کی طرف میں راغب ہونے کی مصیبت میں مبتلا کر دیا گیا، یہ وہ مرض ہے کہ جس کے علاج سے طبیبوں کی ترکیبیں عاجز اور عیادت کرنے والے کی مایوسی طویل ہوجاتی ہے)

(۲۷) كفى بالادب شرفاً انه يدعيه من لا يحسنه ويفرح اذا نسب اليه وكفى بالجهل خمولاً انه يتبراء منه و ينفيه عن نفسه من هو فيه ويغضب اذ نسب اليه، — ادب کے لیے یہی شرف کافی ہے، کہ وہ شخص بھی اس کا مدعی ہے، جو اس کا لحاظ نہیں کرتا اور اپنی طرف اس کی نسبت سے خوش ہوتا ہے، اور جہالت کے لیے یہی گمنامی کافی ہے، کہ وہ شخص بھی اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور اپنی ذات سے اس کی نفی کرتا ہے جو خود جہالت کا شکار ہے، اور اپنی طرف اس کی نسبت سے غضبناک ہوتا ہے،

امیر المومنین کا یہ قول نقل کر کے بیہقی لکھتا ہے[1]: واخذ بعض المولدين معنى قوله فقال: (کسی مولد شاعر نے آپ کے قول کے معنی کو لے کر نظم کیا ہے) اس کے بعد حسب ذیل شعر نقل کیا ہے:

ويكفي خمولاً بالجهالة انني — اراع متى انسب اليها واغضب

[1] البیہقی: المحاسن والمساوی: ۳۹۹

(ترجمہ) جہالت کے لئے یہی گمنامی کافی ہے کہ جب مجھکو اس سے نسبت دی جاتی ہے تو غضبناک ہوجاتا ہوں،

۲۹) ما انقض النوم لعزائم اليوم[۵۱] — نیند کس قدر دن کے ارادوں کو توڑنے والی ہے،

ایک شاعر نے یہ مضمون یوں نظم کیا ہے[۵۲]

فتى لاينام على عزمه — ومن صمم العزم لم يرقد

مرد جب ارادہ کر لیتا ہے، تو وہ سویا نہیں کرتا، اور جو شخص پختہ ارادہ کر لیتا ہے، وہ سوتا نہیں ہے،

۳۰) أحبب حبيبك هونًا ما، عسى ان يكون بغيضك يومًا ما، وابغض بغيضك هونا ما عسى، ان يكون حبيبك يومًا ما[۵۳]

اپنے دوست سے بہ حد مناسب دوستی رکھو ممکن ہے کسی دن وہ دشمن ہوجائے، اور دشمن سے بہ حد مناسب دشمنی کرو ممکن ہے کسی دن وہ دوست ہوجائے،

اس مضمون کو پہلی صدی ہجری کے مشہور شاعر ہدبہ بن الخشرم العذری (المتوفی بعہد معاویہ) نے تین شعروں میں اس طرح نظم کیا ہے[۵۴]

وكن معقلا للحلم واصفح عن الخنا — فانك راءٍ ما حييت وسامع

واحبب اذا احببت حبا مقاربا — فانك لا تدري متى انت نازع

وابغض اذا ابغضت بغضا مقاربا — فانك لا تدري متى انت راجع

(ترجمہ) حلم کی پناہ میں اور بیہودگی سے درگزر کر، اس لئے کہ جب تک تو زندہ ہے، دیکھے گا بھی اور سنے گا بھی، اور جب تو کسی سے محبت کرے تو اعتدال مد نظر رکھ کر، کیونکہ تو یہ نہیں سمجھ سکتا کہ کس وقت اس سے نزاعی صورت پیش آجائے اسی طرح جب کسی سے دشمنی کرے، تب بھی اعتدال کو ملحوظ رکھ نہ معلوم کب وہ دوست بن جائے"

ایک صحابی شاعر نمر بن تولب رضؓ نے بھی اس مضمون کو اپنے ایک مشہور قصیدے میں اس طرح نظم کیا ہے[۵۵]:۔

احبب حبيبك حبا رويدا — فقد لا يعولك ان تصرما

وابغض بغيضك بغضا رويدا — إذا أنت حاولت ان تحكما

(ترجمہ) اپنے کسی دوست سے مناسب حد تک دوستی رکھو، تم اس بات سے بے خطر نہیں ہو کہ تم اس کو اپنے سے کاٹ دو، اسی طرح دشمن سے اس حد تک دشمنی رکھو کہ اگر تم کوشش کرو تو اس کو استوار کر سکو،

اسی مضمون کا ایک شعر عدی بن زید کا ہے[۵۶]

ولا تامنن من مبغض قرب داره — ولا من محب ان يمل فيبعدا

(ترجمہ) گھر کے قریب ہونے کی بنا پر دشمن سے بے خوف مت ہوجاؤ، نہ دوست سے بے خوف رہو، مبادا وہ ملول ہوجائے، اور دوری اختیار کرے۔

---

۵۱ نہج (۳: ۲۵۰، رقم ۴۳۰) ۲: ۲۶۲، رقم ۲۳۶) ۵۲ شرح ابن ابی الحدید، (۲: ۳۶)

۵۳ نہج البلاغہ ۳: ۲۱۷، رقم ۲۶۸)

۵۴ امالی القالی، (۲: ۲۰۴) دیوان ابی الاسود الدولی تحقیق: محمد حسن آل یاسین: ۲۰۔

۵۵ ابوحیان التوحیدی: الادب الانشاء: ۱۲۸،

۵۶ شرح ابن ابی الحدید (۱۹: ۵۶)

(۳۱) وانّ اھل الدُّنیا کرکب، بینا ھو حلّوا اذ صاح بھم سائقھم فارتحلوا،[1]

دنیا والے ان سواریوں کی مانند ہیں، جو منزل پر پہنچیں، اور فوراً ہی انھیں کوچ کا حکم دینے والا پکارے اور وہ کوچ کر جائیں۔

اس مضمون کو تیسری صدی ہجری کے مشہور شاعر ابو العتاہیہ متوفی ۲۱۳ھ نے اس طرح نظم کیا ہے،[2]

إنّ دَاراً نحنُ فیھا لَدَارُ — لیس فیھا لِمُقیم قرارُ

کم وکم قد حَلّھا من اُناسٍ — ذھب اللیل بھم والنھار

فھُمُ الرکب اصابُوا مناخاً — فاستراحوا ساعۃ ثمّ ساروا

وکذا الدُّنیا علی ما رأینا — یذھبُ النّاس وتخلو الدیار

(ترجمہ) بیشک ہم جس گھر میں ہیں وہ ایسا گھر ہے کہ جس میں ٹھہرنے والے کو قرار نہیں، نہ معلوم کتنے انسان اس گھر میں آئے، اور اپنے دن رات گذار کر چلے گئے، اُن کی مثال ایسی سواریوں کی ہے جنھوں نے کوئی اُترنے کی جگہ پائی، پس کچھ دیر آرام کیا، اور پھر چل پڑے، اسی طرح یہ دنیا ہے، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، کہ لوگ اس میں آکر چلے جاتے ہیں، اور ملک کے ملک خالی ہو جاتے ہیں،

(۳۲) رَسُولُکَ ترجمان عقلِکَ، وکتابُکَ اَبلَغُ ما ینطق عنک[3]

تیرا قاصد (سفیر) تیری عقل کا ترجمان ہے، اور تیری تحریر تیرے بیان سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے،

---

[1] نہج (۳: ۲۵۲، رقم ۱۵۴، [2] شرح ابن الحدید (۲۰-۵۳) [3] نہج ۳: ۲۲۶، رقم ۳۰۱)

یہ مضمون ایک شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے،[1]

تخیّرْ اذا ما کنت فی الامر مُرسلاً — فمبلغ آراء الرّجال رسُولُھا

وَرَوِّ وفکّر فی الکتاب، فَاِنّما — بِاطرافِ اقلامِ الرّجال عقولُھا

اگر تم کسی معاملے میں کسی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجو، تو انتخاب کر کے بھیجو، اس لئے کہ سفیر بھیجنے والے کی عقل و دانش کا پیمانہ ہوتا ہے، اسی طرح اگر کسی کو کوئی خط لکھو تو خوب سوچ بچار کر لکھو اسلئے کہ لوگوں کے قلموں کے کناروں میں ان کی عقلیں ہوتی ہیں،

عبداللہ بن جعفر الطالبی متوفی ۸۰ھ نے اس کو ایک شعر میں نظم کیا ہے،[2]

اذا کنت فی حاجۃٍ مرسِلاً — فارسل حکیماً ولا توصِہ

اگر تم کسی ضرورت کے تحت کسی کو بھیجو تو صاحب عقل کو بھیجو اور اس کو کچھ وصیت نہ کرو

(۳۳) عند تناھی الشدّۃ تکون الفرجۃ وعند تضائق حلق البلاء یکون الرخاء[3]

سختی کی انتہا پر کشایش ہے اور مصیبت کے پھندوں کی تنگی کے قریب فراخی ہے،

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے،[4]

اذا بَلَغ الحوادثُ منتھاھا — فرجٌ بعیدَھا الفرج المُطِلّا

فکم کربٍ تولّی اذ توالی — وکم خطب تجلّی حین جلّی

جب حوادث اپنی انتہا کو پہنچ جائیں، تو اس کے بعد کشایش کی امید کرو اسلئے کہ کتنے دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ جب وہ پے در پے آتے ہیں تو اپٹ جاتے ہیں، اور کتنے خطرے ایسے

---

[1] شرح ابن ابی الحدید (۱۹: ۲۰۷، [2] جواہر الادب (۲: ۴۲۴) [3] نہج البلاغۃ (۳: ۲۳۶ رقم ۲۵۱) [4] شرح ابن ابی الحدید (۱۹: ۲۶۷)

ہوتے ہیں، کہ جب وہ انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو ٹل جاتے ہیں،

اسی مضمون کو امیہ بن ابی الصلت نے بھی نظم کیا ہے[۱]

لا تضیقن فی الامور فقد یکشف غمارها بغیر احتیال

ربما تجزع النفوس من الامر له فرجة کحل العقال

معاملات میں دل تنگ نہ ہو اس لئے کہ ان کی تاریکی بغیر کسی حیلے اور تدبیر کے خود بخود چھٹ جاتی ہے، اکثر دیکھا گیا ہے کہ لوگ کسی ایسے معاملے میں گھبرا جاتے ہیں جن کو عقال کی طرح سلجھنا ہوتا ہی ہے،

۳۵) القلب مصحف البصر[۲] دل آنکھ کا مصحف ہوتا ہے،

ایک شاعر کہتا ہے[۳]

انّ العیون لتبدی فی تقلبها ما فی الضمائر من ودّ ومن حنق

بیشک آنکھیں اپنی جنبشوں میں دل کے اندر کی محبت وعناد کو ظاہر کر دیتی ہیں،

۳۵) خیر الامور النمط الاوسط امور میں سب سے بہتر درمیانی طریقہ ہے

الیه یرجع العالی وبه یلحق آگے بڑھ جانے والا اسی کی طرف پلٹتا ہے اور

التالی[۴] پیچھے رہ جانے والا اسی سے آکر ملتا ہے،

امیر المومنین کا یہ قول نقل کر کے ماوردی لکھتا ہے[۵] کسی شاعر نے اس قول کو لیکر اس طرح نظم کیا ہے۔

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید (۱۹: ۲۶۶) [۲] نہج (۳: ۲۵۱، رقم ۴۰۹) [۳] شرح ابن ابی الحدید (۲۰: ۴۶) [۴] یہ قول نہج البلاغہ (۳: ۱۷۲، رقم ۱۰۹) میں اس طرح وارد ہوا ہے:-

"نحن النمرقة الوسطیٰ بها یلحق التالی والیها یرجع الغالی" (ہم مسند نشیں صدر محفل ہیں، جہاں پیچھے رہنے والے آکر ملتے ہیں اور آگے بڑھ جانے والے پلٹ کر آتے ہیں) [۵] ادب الدنیا والدین، ۱۲

لا تذهبن فی الامور فرطاً لا تسئلن ان سألت شططاً

وکن من الناس جمیعاً وسطاً

(ترجمہ) معاملات میں افراط وزیادتی تک نہ جاؤ، اگر تم کچھ دریافت کرو تو حد زیادتی تک ہرگز مت پوچھو اور تمام لوگوں میں درمیانی طریقہ اختیار کرنے والے بن جاؤ،

۳۶) الجار قبل الدار والرفیق قبل الطریق[۱] گھر سے پہلے پڑوسی اور راستے سے پہلے ساتھی کو دیکھو،

علامہ ابن عبد البر لکھتے ہیں[۲]: ایک شاعر نے اس مضمون کو لے کر اس طرح کہا ہے:-

یقولون قبل الدار جار مجاور وقبل الطریق النهج انس رفیق

ایک دوسرا شاعر کہتا ہے،

اطلب لنفسک جیراناً تجاورهم لا تصلح الدار حتی یصلح الجار

(ترجمہ) اپنے لئے پڑوسیوں کو تلاش کرو جن کے قریب تم رہو، اس لئے کہ گھر اس وقت اچھا نہیں ہوتا جب تک پڑوسی اچھا نہ ہو،

ان میں اول الذکر شعر فصل المقال: ۳۱۱ میں بھی ملتا ہے یہی مولف اس قول کے تحت پھر یہ دو شعر لکھتا ہے،

یلوموننی ان بعت بالرخص منزلی ولم یعرفوا جاراً هناک ینغص

فقلت لهم بعد الملام فانها بجیرانها تغلوا الدیار وترخص

ترجمہ) لوگ مجھے ملامت کرتے ہیں کہ میں نے اپنا گھر بہت سستا بیچ دیا لیکن انھوں نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے پڑوسی خراب تھے میں نے انکی ملامت کو سن کر کہا گھر پڑوسیوں کے (اچھے اور برے ہونے) کے سبب سے سستے اور مہنگے ہوتے ہیں،

---

[۱] یہ قول نہج البلاغہ میں مجھ کو نہیں ملا لیکن دیگر ادب کی کتابوں میں امیر المومنین کے اقوال میں یہ ملتا ہے، [۲] بهجة المجالس (باب الجار)

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا عبدالباری ندوی

بنام علامہ سید سلیمان ندویؒ

مولانا عبدالباری ندوی مرحوم اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان بڑے گہرے تعلقات تھے، رفاقت و دوستی، نیازمندی اور عقیدت کا یہ سلسلہ طالب علمی سے عمر کے آخری حصہ تک قائم رہا، باہم خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی، نصف صدی سے زیادہ کی مدت میں یقیناً بہت سے خطوط طرفین نے ایک دوسرے کو لکھے ہونگے لیکن اکثر دست برد زمانہ کی نذر ہو گئے ہیں، ان میں مولانا عبدالباری مرحوم کے جو خطوط محفوظ رہ گئے ہیں ان کا ایک مجموعہ مرحوم کے صاحبزادے مولوی فضل الباری صاحب شائع کر رہے ہیں ان میں سے چند خطوط ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ذیل میں شائع کئے جا رہے ہیں، امید ہے کہ یہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے، "معارف"

اعظم گڈھ، ہندوستان

۲۶ مئی سنہ ۲۰ء

سیدی والا! سلام شوق و نیاز

"بجواب نامہ لندن"[1]

آپ کے مکاتیب "ولایت" اہل وطن کو بہت مطبوع ہو رہے ہیں، اخبارات میں تو ایسی

[1] یہ خط اس زمانہ میں لکھا گیا تھا جب پہلی جنگ عظیم کے بعد دولت عثمانیہ کے حصے بخرے کئے جا رہے

رشک و رقابت کی جلن کا اندیشہ ہے، اب تک تو مصنف "فلسفہ جذبات" نے صرف ہمدم ہی کے کالموں کو شرف اندوز ہونے دیا ہے، وکیل وغیرہ کے طعن آلود تقاضے آنے لگے ہیں، معاصرانہ چشمک کو نقل سے تسکین نہیں ہو سکتی، اس لئے ہر ایک اصل و تقدم کا خواستگار ہے،

جس طرح مغربی سیاست کے اسرار و وساوس آپ کی نظر کے لئے "جالب" ہیں (سید جالب کا حق ثابت ہو گیا) اگر اسی حد تک بلکہ اس سے بڑھ کر وہاں کے علمی پہلو کے نقش آپ کے قلم نے نہ کھینچے تو نہ صرف "سید سلیمانی" ناقص رہ جائیگی بلکہ تلمذ شبلی اور نظامت دار المصنفین کے واجبات کو وہی مایوسی ہوگی جو وفد خلافت کے مطالبات کو برطانیہ کے وزیر اعظم سے ہوئی ہے، یہ عذر کافی نہ ہوگا کہ مستشرقین سے مل کر ازدیاد رنج و ملال کے سوا کوئی حاصل نہیں، مارگولیس اور مانٹیگو سے آپ ایک حیثیت سے کیوں ملیں، سلیمان کا تخت ہمیشہ بلندی پہ اڑا ہے، تاکہ نیچے کی ہر چیز پر نظر پڑے تاکہ دامن بصیرت میں پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی لائے،

چھوٹا منہ بڑی بات، لقمان کو حکمت آموزی کی جرأت حد ادب سے متجاوز ہوا چاہتی ہے

اب یہ فرمایئے کہ "شبلی اکاڈمی" کی یاد ستانے لگی یا ابھی نہیں،

آپ لوگ بھیک مانگنے گئے تھے، اور شرط یہ تھی کہ کچھ چھوڑ کر لے، اس کا مآل جو کچھ ہونا تھا، ہوا، کیا عبرت و حسرت کا اجتماع ہے، کہ جب اسلام کا نام لینے والے چند ہزار ادھر یہ نہ تھے، اس وقت تو قیصر و کسریٰ کے ایوان میں ہم "اسلم تسلم"[2] کا مژدہ لے کر داخل

(بقیہ حاشیہ ص ۴۵۸) تھے، اس ظلم کے خلاف مولانا محمد علی کی قیادت میں ہندوستان سے ایک وفد لندن گیا تھا، تاکہ حکومت برطانیہ کو اس سے باز رکھا جائے، مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس وفد میں شامل تھے "معارف"

[2] اسلام لاؤ محفوظ رہو گے، "روزنامہ ہمدم لکھنؤ"

ہوئے تھے، لیکن آج جب "مدعیانِ اسلام" کروڑوں سے متجاوز ہیں تو ان کا وفد وزیر انگلستان کی پائگاہ پر اس سوال کے لئے ہاتھ پھیلانے جاتا ہے کہ کعبہ کی کنجی خلیفۂ اسلام کو دیدیجئے!!

گدا اگر اپنا لہجہ سخت کرے تو اس سے گدائی کا ننگ نہیں دھل سکتا، اسلام نے اپنے متبعین کو تسخیر قلوب و اجسام کے لئے دو دھاری تلوار حوالہ کی تھی، اسی لئے کہ ایک کند ہو، تو دوسرے سے مدافعت ہو، مذہب کا اصل حربہ (روحانیت) زمانہ ہوا کہ کھو چکے، مادیت کی دوڑ میں دشمنوں کی گرد کو ہم نہیں پاتے، پھر بھی گمراہی نے یہاں تک اندھا کر رکھا ہے کہ نجات تہدید یا فریاد کے شور میں تلاش کی جاتی ہے،

سمندر کے اس پار تو تخویف و التجا کے سوا کچھ ہونا، پہلے ہی سے معلوم تھا، اب ذرا اس پار کا بھی کچھ حال سن رکھئے، ہندو مسلم اتحاد کی منطق کا "تناقض و مغالطہ نمایاں ہو چکا ہے، ممکن ہے اُن لوگوں کو ذرا دیر میں نظر آئے، جن کو اس اتحاد پر نہیں بلکہ حبل اللہ کے اعتصام کے سہارے پر کھڑے ہونے کی دعوت ملی تھی، خود اپنے کیمپ میں بھی تفرقہ پڑ چلا ہے، ان سب پر مستزاد بے عملی کی آخری ساعت سامنے آگئی، یہاں اب تک یہی فیصلہ نہیں ہو سکا ہے کہ کرنا کیا ہے، ہر دل دبدھے میں ہے،

مہاتماجی نے "علاج بالماء" تجویز کیا ہے، جو اول تو مسلمانوں کے مزاج کو راست نہیں آسکتا، دوسرے یہ ایسا تریاق ہے جو "عراق" میں ملتا ہے، اس کا نتیجہ ہوگا کہ جو کچھ شعلے پیدا ہو گئے ہیں، یا تو سفرِ عراق سے پہلے ہی یہ خود ہی خاکستر ہو جائیں گے، یا مسجد کانپور یا جلیان والا باغ کی صورت میں ٹھنڈے ہو جائیں گے،

جو عقول و دماغ اس وقت رہنمائی کر رہے ہیں، ان کا یہ عالم ہے کہ اپنی جگہ پر خود ہی پراگندہ ہیں، دوسروں کو کیا راہ پر لگا دیں گے، یعقوب حسن اور پھر گری کونسل

سے استعفا دیتے ہیں کہ "ترک تعاون" کا وقت آگیا، مہاتما کا اعلان ہوتا ہے کہ ابھی یہ قبل از وقت ہے، امیر مہاجرین کی میزبانی کا پیغام بھیجدیتے ہیں، تو یہاں انجمن مہاجرین قائم ہو جاتی ہے، ۷۷ آدمی ہجرت کر کے سرحد تک جا پہنچے ہیں، جن میں سے ۱۲ کچھ سوچ کر رک جاتے ہیں، عقل اول جس کی نیابت کا فخر آپ کو حاصل ہے، اور رہنمائی کا مجھ کو، ان کا ہجرت پر روزانہ فتویٰ شائع ہوتا ہے، جس کا اگر کچھ مطلب ہوتا ہے، تو یہ کہ "ہجرت کرو اور نہ کرو" شرائط صلح کی اشاعت کے بعد سے بہت زیادہ بے راہ روی پیدا ہو گئی ہے،

مسلمانوں کا علاج صرف مسلمان ہونا ہے، نہیں تو پھر موت ہے، اور اب اسی کے آثار ہیں، کسی کسی وقت دل کڑھتا ہے، اس لئے آپ کو اتنا لکھ مارا، ورنہ عبرت پذیری کے سوا لب کشائی کا وقت نہیں ہے، اور نہ اس کا کچھ حاصل ہے،

جی ہاں سمجھا تو میں بھی یہی تھا کہ "جنازہ بمنزل رسید"[1] لیکن آپ کی حیثیت قیام کی عینک بدلی کہ دار المصنفین کے حالات کو جو دیکھتا ہوں تو پہچاننے میں دشواری ہوتی ہے، ایک امید یہ باقی ہے کہ آپ کے آجانے پر غالباً یہ نقشہ بہت کچھ بدل جائے" سردست تو دار المصنفیت کا عنصر یہاں کی آب و ہوا میں نہایت ہی کم ہو گیا ہے ورنہ اگر شبلی اکاڈمی خاکسار کے وجود کی طالب تھی، تو مطلوب بھی تھی، لیکن اب تو دونوں باتوں میں شک سا پڑ گیا ہے، میں تو تنبی کے ساتھ ہوں کہ

انت الحبیب و لکنی اعوذ بہ

من ان اکون محبا غیر محبوب

آخری فیصلے کو اپنے آنے ہی پر ملتوی جانیے،

انگریزی کتابوں کے لئے ایک فہرست ماجد میاں نے خدمت میں بھیجدی ہوگی، کہئے تو ایک آدھ

---

[1] مولانا عبدالباری صاحب اس زمانہ میں دار المصنفین میں مقیم تھے اور خیال تھا کہ یہیں مستقل طور پر رہیں گے۔

اور پیش کروں، ساری توجہ اینٹ گارے پر صرف ہوئی، کتب خانہ جو دارالمصنفین کی روح تھی، اس پر شاید آج تک ہزار پانسو کا اضافہ نہیں ہوا ہے، اور انگریزی حصہ تو بالکل ہی نادار رہا ہے، جس کی وجہ سے میں اپنے کو معارف کے لئے بالکل بے دست و پا پاتا ہوں، کچھ کتابیں چلتے وقت بمبئی سے خرید لی تھیں، جو کل شام کو یہاں آئی ہیں، کچھ اور بمبئی ہی سے منگا بھیجی ہیں، لیکن ان نظروں سے کتنی دیر لب تر رہ سکتے ہیں،

خطوں میں کچھ اپنا حال بھی لکھا کیجئے، والسلام

عبد الباری ۲۰ مئی ۱۹۲۵ء

حیدرآباد دکن ۲۸۷ یکم ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۲۵ء

سیدی! السلام علیکم و رحمۃ اللہ برکاتہ، مکتوب گرامی باعث سرفرازی ہوا،

نصاب[1] کے متعلق آپ جس کش مکش میں مبتلا معلوم ہوتے ہیں، اس کی مجھ کو کوئی اطلاع نہ تھی، ہمدم کے مضامین بلاشبہہ میری نظر سے بھی گذرے تھے لیکن ان کی اس اہمیت کا میں اندازہ نہ کر سکا، جو شاید آپ کے ذہن میں ہے، مجھکو تو یہ تک معلوم نہ تھا کہ کون سی کمیٹی اور کن حالات کے ماتحت نصاب کی اصلاح کر رہی ہے، واقعہ صرف اتنا تھا کہ شروانی صاحب نے ایک دن یاد فرمایا کہ "ندوہ کے نصاب میں کچھ مشورہ کرنا ہے،" میں سمجھا کہ شاید ان کو از خود اس کا خیال ہوا ہے، لیکن جانے پر دیکھا تو مفتی صاحب'

[1] عرصہ سے ندوہ کا نصاب نظر ثانی کا محتاج تھا، ندوہ کے طلبائے قدیم اور دو حضرت صاحب فکر و نظر حضرات کا اصرار تھا کہ از سر نو اسے مرتب کیا جائے، ۱۹۲۵ء کے اجلاس ندوۃ العلماء منعقدہ لکھنؤ میں یہ مسئلہ پیش ہوا، اور مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا حمید الدین فراہی، مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اور مولانا حفیظ اللہ مہتمم دار العلوم پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی تھی، اس خط میں اسی کے متعلق ذکر ہے،

مولانا شیر علی صاحب وغیرہ تشریف فرما تھے، مفتی صاحب سے مشورہ کے لئے آپ نے خود دعائیہ طور پر تاکید فرمائی تھی، مجھکو البتہ شروانی صاحب نے محض اپنے حسن ظن سے طلب کر لیا تھا، ندوہ کا معاملہ تھا حاضر ہونا پڑا، بہرحال یہاں کے ۵، ۶ علماء کے سامنے آپ کا مرسلہ نصاب شروانی صاحب نے پیش کیا، سبھوں نے کم و بیش اور سب سے زیادہ مفتی صاحب نے اس کو ناپسند فرمایا، میں نے بھی اپنی ناقص بصیرت کے مطابق دو ایک باتیں عرض کیں، بالآخر شروانی صاحب نے ایک سب کمیٹی بنا کر اس کی کارروائی کو میرے حوالہ فرما دیا، میرے نزدیک یہ کام عجلت کا نہ تھا، میں نے پرانے نصاب منگوائے تھے، کہ ان کو سامنے رکھ کر ندوہ کے مقاصد و اصول کے مطابق نیا نصاب ترتیب پا سکے تو اچھا ہے،

پرانے نصاب خدا خدا کر کے کل آئے ہیں، لیکن آپ کے خط سے جو حالات معلوم ہو چکے ہیں، ان کی بنا پر اب سردست کچھ غور و فکر کا موقع نہیں اور گو میں نے اپنی بساط کے مطابق نصاب تعلیم کے مسئلہ پر تھوڑا بہت سوچا ہے، پھر بھی آپ کے مرتبہ اور مولانا حمید الدین صاحب کے مصدقہ نصاب میں رائے زنی کو جاہلانہ گستاخی ہی سمجھتا ہوں، بہ خصوص صاحب کام آپ کر رہے ہیں، تو آپ کے مصالح میں دخل دینا اور بھی بیجا ہے، اگر کبھی دوبارہ موقعہ آیا تو اپنا بُرا بھلا خیال بھی عرض کروں گا،[1]

[1] سید صاحب کے مجوزہ نصاب کا نفاذ تعلیمی سال کے آغاز میں کر دیا گیا، لیکن ابھی مولانا شروانی کی رائے نہ آئی تھی کہ ان دنوں ناظم ندوۃ العلماء نواب علی حسن خاں مرحوم نے رخصت لے لی تھی اور منشی احتشام علی صاحب مرحوم انکے قائم مقام تھے، ان کی رائے تھی کہ چونکہ پوری کمیٹی کی طرف سے ابھی تک نصاب مجلس انتظامی میں پیش ہو کر منظور نہیں ہوا ہے، اس لئے اس کا نفاذ قاعدہ کے مطابق درست نہیں ہے، اس بنا پر انھوں نے اس کا نفاذ ملتوی کر دیا (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۶۸ پر)

سردست واقعات بالا کی گذارش کے بعد اپنے دخل در معقولات اور آپ کی زحمت کی
معافی چاہتا ہوں، ایک باتیں بنانے والے کو کام کرنے والوں میں دخل کا حق نہ تھا، میں
اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن جہاں ندوہ اور دارالمصنفین کا ہیچ ہوتا ہے کچھ نہ کچھ
بول دینے کا خواہ مخواہ جی چاہتا ہے،

بلاشبہ آپ "جھگڑوں رگڑوں" کے آدمی نہیں، لیکن اجتماعی کاموں میں ان سے بچنا
کیسے ممکن ہے، اور پھر جب آپ دوسروں کو ان کی طرف بلاتے ہیں تو خود کو کم ہمت بھی
زیادہ چست رکھنا چاہئے،

میری نسبت آپ نے جو کلمات تحریر فرمائے ہیں، ان کو بجز حسن ظن کے اور کیا سمجھوں،
دعا فرمائیے، کہ خدا آپ حضرات کے حسن ظن ہی کی کچھ لاج رکھے اس حسن ظن سے جب
اپنے اعمال کو ملاتا ہوں تو ندامت سے گردن جھک جاتی ہے، خدا رحم کرے، اور آپ
لوگوں کی زبان میں میرے لئے برکت دے،

اسلام یقیناً دنیا کی نجات کے لئے آیا ہے، اس کا پیرو قطعاً انفرادی نجات کے
بعد اجتماعی نجات کا بھی مکلف ہے، لیکن مقدم پہلی ہی چیز ہے، اس کے بغیر دوسرا نتیجہ نہیں
نکل سکتا، اسی کی طرف اشارہ ہے، کہ لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ، اور مسلمانوں کی بڑی
ناعاقبت اندیشی اسی میں ہے کہ انھوں نے مقدم کو موخر ہی نہیں بلکہ نظرانداز کر دیا ہے،

(بقیہ حاشیہ ۴۶۳) اس پر ندوہ کے قدیم وجدید طلبہ اور اصلاح پسند اصحاب نے اخبارات میں مضامین
لکھے، اور ارکان ندوہ کو خطوط لکھے، بالآخر یہ طے پایا کہ ابتدائی سہ سالہ نصاب فی الحال رائج کر دیا
جائے، اگلے سال حیدرآبادی کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں پورا نصاب نظرثانی کے بعد نافذ کیا گیا،
یہ نصاب بعض اعتبارات سے بہت اچھا تھا خصوصاً فلسفہ اور علم کلام کا نصاب بہت جامع تھا، "معارف"

آپ کی خانقاہ (خدا اس کو خانقاہ کرے) میں شریک ہونے کی دلی آرزو ہے، دعا فرمائیے کہ
اس میں شرکت کا اہل ہو سکوں، حیدرآباد سے اب دل بھر چلا ہے، خدا کی مرضی کا انتظار ہے،

میاں سعد الدین کی طرف توجہ فرمائی کا ممنون پذیر ہوں،

جی نہیں ذی الحجہ میں تو حاضری کا خیال نہیں، محرم میں البتہ امکان ہے، والسلام

عبدالباری
۵ اگست سنہ ۱۹۲۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حیدرآباد دکن   ۱۳ دسمبر سنہ ۴۱ء

سیدی المحترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تاخیر جواب کی معافی چاہتا ہوں، جس غریب کے سوچ بچار
میں اتنی تاخیر ہوئی، اس کا جواب بھی سمجھ میں نہیں آیا، کہ آپ کی خدمت میں کیسے عرض کروں
خیر ضرورت رہی تو پھر دیکھا جائیگا، یا موقع ہوا تو زبانی عرض کروں گا،

مولوی مسعود علی صاحب کا مولانا مدظلہ کے قدموں تک پہنچنا تو میری[1] مانگی مراد ملی،
لیکن آپ کے متعلق تو آپ جانتے ہیں، کہ منہ مانگی مراد ملی ہے، اور اگر اس میں آپ کے نزدیک
میری ترغیب و تحریض کا کوئی حصہ ہے، تو انشاء اللہ آپ کی شہادت کے ساتھ میرے نامۂ اعمال
کا سرمایہ ہوگا، بات یہ ہے کہ ایک طرف آپ کے دماغ سے زیادہ میں آپ کے دل کا معتقد
ہوں، اس آئینہ کو بس تقابل کی ضرورت تھی، دوسری طرف ڈرتے ڈرتے عرض کرتا ہوں
کہ بے تقویٰ کے علم پر اعتقاد نہیں رہا، اور تقویٰ بے صحبت کے محال عقلی نہیں تو عادی
ضرور ہے، صحابیت کا نام صحبت کے سوا کیا ہے، کہ جس کے ادنیٰ سے ادنیٰ مرتبہ کا مقابلہ

---

[1] یہ اس زمانہ کا خط ہے جب سید صاحب اور مولانا مسعود علی صاحب مولانا تھانوی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو چکے تھے،

بھی کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ عمل نہیں کر سکتا، مولانا اس صحبت کی نسبت اکثر فرمایا کرتے ہیں، کہ "پیش مردے کاملے پامال شو" اور اس راہ کی حقیقت ہی ساری فنا و پامالی ہے، اور علم کی راہ کا جاہی بقاء اکثر بالکل اس کی ضد واقع ہو جاتا ہے، شاید "حجاب اکبر" کا ایک مطلب یہ بھی ہو، میں تو کہنا چاہئے کہ بس اس علم کے پاس ہو کر نکل گیا تھا، مگر آج تک اس کے حجاب سے محجوب ہوں،

توجہ بینک آپ نے دیر میں فرمائی، پھر بھی صدق طلب کے لئے مطلوب دور نہیں، صدق طلب کا نشان "جاہدوا فینا" مقرر فرمایا گیا ہے، پھر تو جیسا آپ نے تحریر فرمایا "منزل پہ پہنچانا جس کا کام ہے وہ پہنچائے گا" اور اس کا قطعی وعدہ ہے، کہ پہنچائے گا "لنھدینھم سبلنا" یکسوئی شرط ہے، لگن ہو تو یہ بھی آسان ہے،

معاف فرمائیے گا قلم مخاطب کے ادب و مقام سے باہر ہو رہا ہے، خصوصاً اس شخص کے لئے جو خود اندر سے بالکل خالی ہو، اس میں تو ترفع بالکل نہیں، میرا سرمایہ صرف "احب الصالحین ولست منھم" ہے کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے صدقے میں مغفرت فرمائے،

جی ہاں مولوی مسعود صاحب کے متعلق تو مجھکو امید تھی کہ انشاء اللہ وہ اس میدان کے بھی غازی مرد ہی ثابت ہوں گے، لیکن انشاء اللہ ان کی رفتار تو کچھ ایسی تیز ہے کہ اس حد تک میرا وہم و گمان نہ تھا، آپ کو تو حال دیکھ کر غبطہ ہو رہا ہے، اور مجھ کو صرف خطوں ہی میں پڑھ کر غبطہ کیا کچھ حسد سا ہو رہا ہے، اصل یہ ہے کہ ان کے پاس ایمان کی دولت ہمیشہ سے بہت مستحکم تھی اور پھر جدھر جھک جائیں انگلی وہی اور وہی ہیں ہی، اس کے بعد تیسری چیز رہی کیا جاتی ہے، میں نے تو اب کی ان کو لکھا کہ آپ کے ساتھ سے کچھ سہارے کی توقع تھی، مگر مجھ کو تو آپ کی دوڑ میں اپنے گر پڑنے کا اندیشہ

ہوتا ہے، سعادت ازلی ضرور کسی نہ کسی وقت رنگ لاتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی اس سعادت کے پوری طاقت کے ساتھ ظہور کا وقت آگیا، بس اللہ کی دین ہے، اس میں کیا دیر لگتی ہے،

تقریب[1] کا حال مولوی مسعود صاحب سے میں نے خود ہی پوچھا تھا، اور بخیر و عافیت انجام پر خوشی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ فریقین کو مبارک فرمائے، اور آپ کو اب زیادہ سے زیادہ ان چیزوں سے یکسوئی عطا فرمائے،

امید کہ اور سب خیریت ہوگی، کبھی یاد آجاؤں تو ایمان پر خاتمہ اور مغفرت کی دعا کی درخواست ہے، رسماً نہیں جیسا اوپر عرض کیا، میرا سہارا صرف "الصالحین" کی دعائیں ہیں انشاء اللہ ۱۰ دسمبر کو لکھنؤ پہنچوں گا، آپ کا دسمبر میں لکھنؤ کی طرف گذر نہ ہوگا؟

والسلام مع الاکرام

خادم ناکارہ

عبدالباری غفرلہٗ

---

[1] سید صاحب کی لڑکی کی شادی،

مکاتیب شبلی

مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے دوستوں عزیزوں اور شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ، جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی و تعلیمی مسائل اور ادبی نکات ہیں، یہ محض خطوط کا مجموعہ ہی نہیں ہے، بلکہ درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی ملی و علمی تاریخ ہے، پہلی جلد میں دوستوں اور عزیزوں کے نام خطوط ہیں اور دوسری جلد تمامتر شاگردوں کے نام کے خطوط پر مشتمل ہے، جلد اول قیمت ہے، جلد دوم زیر طبع، منیجر

تلخیص و تبصرہ

امریکہ میں اسلام اور اسلامی ادارے

از۔ حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دارالمصنفین

امریکہ سے پوری واقفیت تو کولمبس کے تاریخی سفر کے بعد ہی ہوئی، مگر بعض لوگوں نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ کچھ عرب جہاز ران اس سے پہلے ہی بحر اوقیانوس عبور کرکے مشرقی امریکہ کے ساحل تک پہونچ گئے تھے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ امریکہ کے مغربی ساحل تک پہونچنے کے لیے انھوں نے نیوزی لینڈ کو ایک تجارتی مرکز کی حیثیت سے استعمال کیا تھا، ان قدیم روابط کا علم ابھی حال ہی میں بعض تہذیبی آثار و نقوش کی تلاش و تحقیق کے بعد ہوا ہے۔

کولمبس کے بعد جب باضابطہ نئی دنیا سے پرانی دنیا کے تعلقات قائم ہوئے، تو زیادہ تر لوگ یورپ سے آئے، تھوڑے مسلمان مزدوروں کی صورت میں افریقہ سے پہونچے ان قدیم مسلم مہاجرین کے بارے میں اطلاعات ناکافی ہیں، پھر بھی مختلف ریکارڈ اور نقوش و آثار سے ان کے وجود اور طرز معاشرت کا پتہ چلتا ہے، ناصر الدین نامی ایک مسلمان کا بھی ذکر ملتا ہے، جن کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک مصری شاہزادہ تھا، جو نیویارک مستقل سکونت کی غرض سے آیا تھا، اور مقامی سرخ ہندیوں میں ایک ممتاز حیثیت کا مالک ہوگیا تھا، ممکن ہے وہ اس مملوک خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس نے مصر پر ۱۵۱۷ء تک حکومت کی پھر سلطان سلیم عثمانی کے ہاتھوں اس خاندان کا اقتدار

ختم ہوگیا، شاید، ناصر الدین اسی زمانہ میں کسی طرح امریکہ چلا آیا ہو، ایک نام شمالی افریقہ کے ابن علی کا بھی ملتا ہے جنھوں نے امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران اپنے حلیفوں کے شانہ بشانہ جنگ کی تھی، ان اہم مہاجرین کے علاوہ بہت سے مسلمان ایسے بھی تھے جنھیں یورپی باشندے افریقہ سے پکڑ کر لے گئے تھے، تاکہ ان سے کام لیں، غلامی کی پابندیوں اور سختیوں کی وجہ سے بہت سے اپنے مذہبی عقائد و روایات پر کاربند نہ رہ سکے اس لیے بہت جلد آنے والی نسلیں، اپنے مذہب، زبان اور اسلاف کی روایات سے ناواقف ہوگئیں، لیکن کچھ جوان مرد ایسے بھی تھے جو شدید اذیتوں کے باوجود اپنی روایات سے دستبردار نہ ہوئے، اور اسلام کے کچھ نہ کچھ آثار ان کے اندر باقی رہے، سور اور شراب سے اجتناب اور ناموں میں اللہ و محمدؐ سے انتساب ان کی حقیقت کا پتہ دیتا ہے، لیکن . . . . . اسلامی اداروں اور تنظیموں کی شکل میں ان کے حقیقی اثرات انیسویں صدی کے اواخر میں محسوس ہوئے، یورپ میں معاشرتی انقلاب، امریکہ میں غلامی کے انسداد اور جہاز رانی کی ترقی کی بنا پر امریکہ میں خوش حالی کے نمایاں آثار نظر آنے لگے، ان حالات کی وجہ سے عالم اسلام سے بڑی تعداد میں مسلمان امریکہ کا رخ کرنے لگے، زار کے زیر اقتدار روس اور اس کے پڑوسی مسلم ممالک سے لڑائیاں بھی مسلمانوں کے ترک وطن کا باعث بنیں، اشتراکی انقلاب کے بعد یہ رفتار اور تیز ہوگئی، مشرقی یورپ کے مسلمان بھی دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی تعداد میں امریکہ آکر آباد ہوگئے، آج شمالی امریکہ کے بہت سے علاقوں میں تاتاری، قزاقستانی، قرغیزیائی، البانوی، ترک اور یوگوسلاوی مسلمان مقیم ہیں، اس کے علاوہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں عرب باشندے بھی اعلیٰ تعلیم کے حصول کی غرض سے امریکہ آئے، اس صدی کے اوائل میں تو یہ تعداد خاصی بڑھ گئی، اور حالیہ برسوں میں فلسطین سے بھی کافی لوگ آگئے، غلامی کے

انسداد کے بعد یہاں کے کارخانوں میں باعزت طریقہ سے کام کی غرض سے ہندوستانی اور انڈونیشی محنت کش بھی آئے ان میں مسلمان بھی تھے، اور اب ان کی اولاد مختلف علاقوں میں خوش حالی اور فارغ البالی کے ساتھ رہ رہی ہے، ان کی اپنی مسجدیں ہیں، اسکول ہیں اور مضبوط تنظیمیں ہیں، سرینام (ڈچ گیانا) میں مسلمان تقریباً ۸۰ ہزار ہیں، جن میں زیادہ تر انڈونیشی نژاد ہیں، ٹرینیڈاڈ میں ۶۰ ہزار مسلمان ہیں اور کم از کم ۶۰ مسجدیں ہیں، برطانوی گیانا میں ۶۵ ہزار مسلمان اور سو سے زائد مسجدیں ہیں، وینیزویلا میں ۵۴ ہزار کی مسلم آبادی ہے، جبکہ باربڈوس اور کیوراکاؤ میں بھی خاصی مسلم آبادی ہے، ارجنٹائنا کی مسلم آبادی ۳ لاکھ ۵۰ ہزار بتائی جاتی ہے، مسلمانوں نے اس صدی کے اوائل میں نسلی اور قومی بنیادوں پر اپنی تنظیموں کی تشکیل شروع کر دی تھی، لیکن ان کے ناموں میں بہرحال اسلامی جھلک نمایاں تھی، مثلاً تاتاریوں نے ۱۹۲۳ء میں نیویارک میں "امریکن محمڈن سوسائٹی" قائم کی اور عربوں نے ۲۳ء میں "ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن" کی بنیاد ڈالی، ایسی ہی قومی انجمنیں دوسرے شہروں میں بھی قائم ہوئیں، جو اکثر اعلیٰ اسلامی اقدار کے بجائے محدود قومی و نسلی خصوصیات کی علمبردار تھیں۔

عالم اسلام کے مختلف گوشوں سے آنے والے مہاجرین کے علاوہ جن کی تعداد جنوبی امریکہ میں ۵ لاکھ سے زیادہ ہے، شمالی امریکہ میں بھی مسلم آبادی تقریباً اتنی ہی ہے، ان میں وہ مسلمان بھی شامل ہیں جو عارضی قیام کی غرض سے آئے ہوئے ہیں، بہت سے لوگ مختلف سفارت خانوں، قونصلوں اور اقوام متحدہ کے ممبر مسلم ممالک کے دوسرے اداروں سے وابستہ ہیں، ان بیرونی مسلمانوں کے علاوہ بہت سے امریکی باشندے بھی حلقہ بگوش اسلام ہوگئے ہیں، اگرچہ اس راہ میں کچھ دشواریاں حائل ہیں، جن کا باعث وہ صلیبی جنگیں ہیں

جو سینکڑوں برس ہوئی تھیں، اور ان سے پیدا ہوئی بہت سی غلط فہمیاں بھی ان دشواریوں کا ایک سبب ہیں، یہ غلط فہمیاں بچوں کی نصابی کتابوں سے ہی شروع ہو جاتی ہیں، ایک امریکی کے نقطۂ نظر سے اسلام کی تعریف بس یہ ہے کہ اس مذہبی فرقہ کے بانی (حضرت) محمدؐ ہیں، جنھوں نے یہودیت اور نصرانیت کی مشترکہ صداقتوں کو اپنایا، اور تلوار کی دھار پر اسے پیش کر دیا، ابھی حال ہی میں نیویارک کے کورٹ ہاؤس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مجسمہ مسلم سفارت خانوں کی درخواست پر ہٹا دیا گیا، اس مجسمہ کے ذریعہ حضورؐ کو ایک غضبناک ذی الجثہ، دیوپیکر صورت میں دکھایا گیا تھا، آپ کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں، ایک ہاتھ میں قرآن، دوسرے میں تلوار ہے، اسلام کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ عورت کو محکوم بنا کر رکھتا ہے، اور اس پر ناگفتہ بہ مظالم کو روا رکھتا ہے، لیکن اس پروپیگنڈہ کے باوجود امریکہ کا ذہین اور صاحب علم طبقہ اسلام سے قریب آتا جا رہا ہے، اور اب بے یقینی اور بے چینی کی موجودہ فضا میں دوسرے مذاہب کے پیرو اسلامی تعلیمات میں روحانی سکون محسوس کرتے ہیں اور اس کے متوازن نظام حیات اور معاشرتی عدل و مساوات سے ان کی دلچسپی روز افزوں ہے، سب سے پہلے جو امریکی مشرف بہ اسلام ہوئے وہ مسٹر الیگزنڈر رسل وب ہیں، ۱۸۸۷ء میں بحیثیت قونصل جنرل وہ منیلا گئے تھے، وہاں مقامی مسلمانوں سے روشناس ہوئے، اسلامی تعلیمات نے انھیں اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے قبول اسلام کا اعلان کر دیا اور محمد نام رکھا، انھوں نے کہا کہ میں تنقیدی مطالعہ کے بعد اس نتیجہ تک پہونچا کہ اسلامی نظام حیات ہی روحانی تقاضوں کو بحسن و خوبی پورا کرتا ہے، کرنل ڈانلڈ ولیس راک ویل ایک امریکی، شاعر نقاد اور مصنف نیز ایک اور جویائے حق تھامس (وارث) محمد نے اسلام قبول کیا، اور جرأت مندی سے اسلام کے محاسن و خصوصیات

کے بارے میں مضامین لکھے۔ ان انفرادی واقعات کے علاوہ مقامی نومسلم عرب سے
گر آئے ہوئے معلمین کی مدد سے تبلیغ اسلام کی اجتماعی کوششوں میں لگے ہوئے تھے،
ایک کامیاب داعی صوفی عبدالحمید نامی تھے، یہ افریقی النسل امریکی نومسلم تھے، اسلام کے
ایک اور مشہور داعی مرحوم ڈاکٹر عبدالودود بے تھے، جن کے اکثر مضامین، ان کی
دقت نظری اور وسعت مطالعہ کے غماز ہیں۔

اس صدی کے شروع کے تیس برسوں میں یہ تبلیغی کوششیں حیرت انگیز حد تک
کامیاب رہیں، ۱۹۳۰ء میں وفات سے قبل صوفی عبدالحمید نے ۳۰۰۰ سے زائد امریکیوں
کو حلقہ بگوش اسلام کیا اب یہ کوششیں صرف تبلیغ اسلام تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ
مسجدوں اور قبرستانوں کے انتظام اور بچوں اور جوانوں کے لیے اسلامی درسگاہوں
کے قیام اور دیگر مذہبی ضروریات کی جانب بھی توجہ کی جانے لگی، ۱۹۳۰ء میں نیویارک
میں ایک مورش اسلامک سنٹر، ڈاکٹر عبدالودود بے اور ان کی بیوی رازقہ بے کی
مساعی سے قائم ہوا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد امریکہ کے تجارتی و صنعتی مراکز میں مسلمانوں کے خوشگوار
اضافہ نے ایک ایسی مرکزی تنظیم کی اہمیت کا احساس دلایا جو مسلمانوں کے مختلف طبقات
کی دیکھ بھال کرے اور ان کی مشکلات کے حل میں مدد دے، چنانچہ اس سمت دو قدم
اٹھائے گئے۔ ایک تو واشنگٹن میں اسلامک کلچر سنٹر کا قیام، دوسرے امریکہ اور کناڈا
میں پھیلی ہوئی مختلف مسلم تنظیموں کے ایک وفاقی مرکز کی تاسیس، واشنگٹن میں ایک
اسلامی مرکز کے قائم ہونے سے یہ امید تھی کہ اس قسم کا ادارہ اسلام اور مسلمانوں کی مذہبی
ضروریات کو بہتر طور سے انجام دے سکے گا، چنانچہ زمین خریدی گئی منصوبہ نے عملی جامہ پہنا

اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۳ء تک سارا کام انجام پاگیا، ایک شاندار مسجد اس کے پہلو میں ایک
لائبریری، دفتر چند کلاس روم اور ایک آڈیٹوریم بن کر تیار ہو گئے، اس کے جشن افتتاح
میں صدر امریکہ بھی شریک ہوئے تھے، چند حضرات کا خیال ہے کہ یہ مرکز اسلامی مرکز ہونے
کے بجائے سیاحوں کی کشش کا مرکز ہو کر رہ گیا ہے، اور اپنے مقاصد میں اس حد تک کامیاب
نہیں جتنا اس کی فعال اور ہم آہنگ لیڈرشپ سے توقع تھی، لیکن یہ خیال کچھ ہی لوگوں
کا ہے، اصل یہ ہے کہ مسجد کی خوبصورت عمارت سیاحوں کو خودبخود اپنی جانب متوجہ کر لیتی
ہے، اکثر لوگ اس مرکز کی شاندار خدمات کے معترف ہیں۔

مسلم تنظیموں کے ایک وفاقی مرکز کے خیال کی تعریف تو بہت سے رہنماؤں کی جانب
سے کی جاتی رہی ہے لیکن عملی قدم سیڈرریپڈ کے مسلمانوں نے اٹھایا، جن کی مسجد اور سوسائٹی
امریکہ میں مسلمانوں کے نقش اولیں کی حیثیت رکھتی ہے، ۱۹۵۲ء میں اپنے شہر میں ایک
اجتماع منعقد کر کے انھوں نے سارے مسلمانوں کو شرکت کی دعوت دی، ۴ ہزار مسلمانوں
نے اس دعوت پر لبیک کہا اور اجتماع میں عام غور و فکر کے بعد طے پایا کہ انٹرنیشنل مسلم
سوسائٹی کے نام سے ایک مرکزی انجمن قائم کی جائے، اس کے بعد یہ اجتماعات ٹولیڈو اور
شکاگو میں منعقد ہوئے، تیسرے کنونشن میں اس کا دستور تیار ہوا اور اس سوسائٹی نے فیڈریشن آف
اسلامک ایسوسی ایشن کے نام سے ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کام شروع کیا، اس انجمن کا مقصد
یہ ہے کہ اسلامی فکر اور تہذیب کے لیے زیادہ وسیع میدان عمل مہیا کیا جائے، اسلام کی صحیح اور
واقعی تصویر کو ہم وطنوں کے سامنے پیش کرنا اور مسلمانوں کی بنیادی تعلیم اور مذہبی ضروریات
کی فراہمی بھی انجمن کی اہم ذمہ داری ہے، اور اب تو انجمن کے ممبروں کو اخلاقی قانونی
اور اقتصادی سہولتیں بھی فراہم کی جانے لگی ہیں، انجمن کا ایک بڑا کام یا کارنامہ یہ بھی ہے،

کردہ اسلام کے بارے میں پھیلے ہوئے غلط نظریات وخیالات کے ازالہ میں مصروف ہے،
اس سلسلہ میں وہ یونیورسٹیوں، اسکولوں اور لائبریریوں کو کتابیں فراہم کرتی رہتی ہے۔
"دی مسلم اسٹار" ایک ماہنامہ بھی نکلتا ہے، ایک کتابچہ "اسلام" نامی تیس ہزار کی تعداد میں
حال ہی میں تقسیم کیا گیا ہے، قرآن مجید کا ایک ترجمہ بھی "Selection from the Noble Reading" کے نام سے شائع ہوا ہے، اس فیڈریشن کے زیر اہتمام ہے۔
امریکہ میں مسلم شماری کا کام بھی ہو رہا ہے، اب تک تقریباً دہ ہزار گھرانوں کا اندراج
ہو چکا ہے، اسلامی مدارس کو اعلیٰ سطح پر لانے کی غرض سے ایک منصوبہ بھی تیار کیا گیا ہے،
اس وقت وہ کونسل آف امامز کے زیر غور ہے۔

"دفتر ازالہ غلط بیانی" یہ دفتر اپنی نوعیت کے لحاظ سے فیڈریشن کے پروگراموں
کا اہم جزو ہے، اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ دانستہ یا نادانستہ اخباروں، رسالوں،
کتابوں، ریڈیو اور ٹیلیویژن کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے، اس طرح اسلامی تحریک کو نقصان
پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے، فیڈریشن اس پروپیگنڈے کا تسلی بخش جواب دیتی رہتی ہے
فیڈریشن کے سالانہ کنونشن بھی خاصہ کی چیز ہوتے ہیں، ان اجتماعات میں فیڈریشن کی تمام
ممبر تنظیمیں شریک ہوتی ہیں، وسیع اور پرمغز مباحثے ہوتے ہیں ان میں مقامی مسائل کے
علاوہ عالم اسلام کے مسائل کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے، مختلف ممالک کے وفود بھی ان اجتماعات
میں شریک ہوتے، اور عالمگیر اسلامی اخوت کے رشتوں کو مضبوط بناتے ہیں، فیڈریشن کے
پاس ۱۳۱ ایکڑ کا وسیع قطعہ آراضی ہے۔ اب یہ یوتھ کیمپ کے لیے مخصوص ہے۔

مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن (ایم، ایس، اے) امریکہ کی یہ دوسری بڑی مسلم
تنظیم ہے، جو مسلم طلبہ کی جہد مسلسل کی آئینہ دار ہے، ۱۹۶۱ء میں اس انجمن کی تشکیل ہوئی

بنیادی مقصد اس تنظیم کا ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو حسن اخلاق اور پاکیزگی قلب
ونظر کا مظہر ہو اور جہاں برائیوں سے بچنے کا جذبہ پیدا ہو، مسلمانوں میں ہم آہنگی اور مسائل
کو مل جل کر حل کرنے کی ضرورت ماضی کے مقابلہ میں اب کچھ زیادہ ہی ہے، ایم ایس اے
اسی عظیم مقصد کی خاطر جد وجہد کر رہی ہے، اپنے ممبروں کے لیے تعلیم وتربیت کے پروگرام
مرتب کرتی ہے، اور کوشش کرتی ہے کہ مذہبی، سماجی، معاشی، اخلاقی، ادبی، اور سائنسی
میدانوں میں اسلامی روح کارفرما ہو، اس کی ایک شاخ خواتین سے متعلق بھی ہے جو امریکی خواتین میں تیزی سے مقبولیت
حاصل کر رہی ہے، ایم، ایس، اے کا ایک سہ ماہی ترجمان "الاتحاد" کے نام سے شائع
ہوتا ہے، متعدد کتابیں بھی یہ جماعت شائع کر چکی ہے،

ان کے علاوہ دوسری بہت سی مقامی مسلم تنظیمیں ہیں جن کے دائرہ عمل میں مسجدوں
کی تعمیر، بچوں کی اسلامی درسگاہوں کا قیام، مباحثہ کی مجلسوں کا انعقاد، اور اسلامی
تیوہاروں کا انتظام ہے ان کے کارکن زندگی کے عام معاملات میں ایک دوسرے کے
ساتھ تعاون کرتے ہیں، ان تنظیموں کی کوشش ہے کہ امام یا دوسرے الفاظ میں تنظیم کا
ڈائرکٹر اسلام کا سچا نمونہ ہو۔ وہ صرف یہی نہیں کہ امامت اور وعظ ونصیحت کے فرائض
انجام دے، ادارہ کی تنظیمی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالے اور گوشہ گوشہ سے آئے ہوئے
خطوط اور ٹیلیفونوں کا جواب دے بلکہ وہ رات دن اپنے طبقہ کے افراد کی تکلیفیں دور
کرنے اور انھیں مدد پہنچانے کے لیے بھی تیار رہے، اس موقع پر ان حضرات کا ذکر بھی
ضروری ہے جو ان اسلامی تنظیموں میں پیش پیش ہیں، اس سلسلہ میں نیویارک کے
اسلامک سنٹر کے موجودہ ڈائریکٹر ڈاکٹر حسنی جبار خاص طور سے قابل ذکر ہیں، نماز کے
متعلق ان کی کتابیں بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہیں، امام محمد جواد کی کتاب

"Inquiry about Islam".

انگریزی زبان کی اسلامی تصانیف میں ایک قابل قدر اضافہ ہے، امام سلیمان، امام دوہبی ہمٹبس، امام عادل الاثیر، امام کرد ب، ڈاکٹر کامل ایڈریچ، امام عبدالمنعم خطاب ڈاکٹر محسن البائکی، ڈاکٹر معین الدین، مسٹر قاسم محمود وغیرہ نمایاں ہستیاں ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں جن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

سفید فام امریکیوں کے ساتھ نیگرو بھی اسلام کی طرف مائل ہیں، ان کی گرویدگی کا باعث یہ ہے کہ اسلام ایک صاف ستھرا اور سادہ مذہب ہے، وہ عالمگیر مساوات کا حامی ہے، اور اپنے ماننے والوں کو عزت وجمعیت عطا کرتا ہے بعض وجوہ کی بناء پر نیگرو مسلمانوں نے مخصوص قواعد وضوابط کے ساتھ اپنی الگ تنظیمیں قائم کر رکھی، ہیں یہ تنظیمیں بڑے شہروں مثلاً نیویارک، فلاڈلفیا، شکاگو، کلیولینڈ اور واشنگٹن وغیرہ میں موجود ہیں، لیکن نام سب کے اسلامی ہی ہیں، جیسے دارالاسلام، مسجد یاسین، مسجد المہاجرین، مسجد الامت، انصار الاسلام اور بیت قریش، عالیجاہ محمد مرحوم کے نیشن آف اسلام سے وابستگی کی بنا پر وہ اپنے آپ کو آرتھوڈکس مسلم کہتے ہیں، آج کل ان کے قائد ولس محمد ہیں، اگرچہ عالی جاہ محمد کے پیرو ابھی پورے طور پر مسلمان نہیں سمجھے جاتے ہیں، مگر وہ اسلام سے بہت قریب ہیں، اور کیا عجب ہے کہ آگے چل کر وہ اسلام کے مخلص پیرو بن جائیں۔

(خلاصہ از پندرہ روزہ امپیکٹ انٹرنیشنل)

اسلام کا سیاسی نظام

مؤلفہ مولانا محمد اسحٰق سندیلوی، قیمت: ۹-۴۰

"منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب طفیل احمد مدنی

محبت میں اصولِ امتحاں کچھ اور ہوتا ہے
نظر کچھ اور کہتی ہے بیاں کچھ اور کہتا ہے

قفس میں لاکھ حاصل ہو زمانے بھر کی آسائش
مگر اے دوست لطفِ آشیاں کچھ اور ہوتا ہے

یہ مانا بزمِ گل بھی دلکش و پرکیف ہوتی ہے
مگر لطفِ حریمِ جانِ جاں کچھ اور ہوتا ہے

بہار و غنچہ و گل سے بھی ہے زیبِ چمن لیکن
وہ ہوتے ہیں تو رنگِ گلستاں کچھ اور ہوتا ہے

نشانِ نقشِ پا سے بھی پہنچ جاتے ہیں منزل تک
مگر فیضانِ میرِ کارواں کچھ اور ہوتا ہے

یہاں تو عذرِ شکوہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی
مرے ناصح حسابِ دوستاں کچھ اور ہوتا ہے

طفیلؔ آتے ہیں یوں تو سیکڑوں مضموں غزلوں میں
مگر ذکرِ حدیثِ دلبراں کچھ اور ہوتا ہے

غزل

از جناب راحتؔ گوالیاری صاحب

فراق و وصل کی پروا نہیں ہے عشقِ کامل کو
تصور میں لئے پھرتا ہے مجنوں حسنِ محمل کو

جہاں والو بڑھا دو نہ میری وحشتِ دل کو
الٹ دے گی مری دیوانگی دنیا کی محفل کو

یہ بحرِ غم، یہ موجیں اور یہ طوفاں خدا حافظ
سفینہ چل دیا ہے چھوڑ کر خود اپنے ساحل کو

پہنچنے دیگا منزل تک مجھ کو خوفِ رسوائی
ذرا خاموش کر دیوانگی شورِ سلاسل کو

قفس کی تیلیوں کو شاخِ گل کا روپ دینا ہے
بنانا ہے چمن اپنا، لہو دے کر عنادل کو

سمٹ آئیں بلائیں چار دل جانب سے راحتؔ
تصور میں جہاں بھولے سے میں لایا ہوں ساحل کو

مطبوعاتِ جدیدہ

القائد الی عیون العقائد: تالیف المعلم عبدالحمید الفراہیؒ متوسط تقطیع کاغذ عمدہ، (عربی)
خوبصورت ٹائپ صفحات ۲۰۰، قیمت ۲ روپئے، پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ،

اسلام میں عقیدہ کی اہمیت کی وجہ سے قدیم علماء نے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن یونانی فلسفہ و کلام سے کثرت اشتغال کی بنا پر ایسے اہم اور بنیادی مسئلہ میں بھی ان کا دار و مدار معقولات و مظنونات پر زیادہ رہا، اسی لئے امت میں مختلف فرقے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر کو مدلل کرنے کے لئے قرآن مجید میں غیر ضروری اور دور دراز کار توجیہ و تاویل ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک فرقے نے دوسرے فرقہ کی تکفیر بھی کی ہے، ترجمان القرآن مولنا حمید الدین فراہیؒ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں خاص بصیرت اور اس کی فہم و معرفت کا اعلیٰ ذوق عطا فرمایا تھا، اُن کی زندگی کا بڑا حصہ کتاب اللہ پر غور و فکر میں بسر ہوا، اس لئے عقائد کے معاملہ میں انھوں نے تمامتر قرآن مجید پر اعتماد کیا ہے، اور اُن سے متعلق وہی باتیں تسلیم کی ہیں جو ظن و تخمین کے بجائے نقل صحیح اور عقل صریح سے ثابت ہیں، زیر نظر کتاب میں مولانا نے قرآن حکیم کی روشنی میں اسلام کے تین بنیادی عقیدوں الوہیت، رسالت اور معاد کے بارہ میں اپنے نتائج فکر پیش کئے ہیں، یہ دراصل اُن کی تفسیر نظام القرآن کا جزء ہے، عقائد کی اہمیت کی بنا پر نیز تفسیر میں جا بجا اُن کے مباحث کے اعادہ و تکرار سے بچنے کی غرض سے اُن کو اس موضوع

پر ایک مستقل کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا جو ایک مقدمہ اور تین ابواب پر مشتمل ہے، مقدمہ میں عقیدے کی اہمیت اور اس کے سلسلہ میں بعض ضروری اور اہم اصول بیان کئے گئے ہیں، پہلے باب الوہیت میں اللہ کے ناموں، اس کی صفتوں اور اس کی جانب منسوب افعال کے بارہ میں جو صحیح عقیدہ قرآن نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے یا جس کی نظم قرآن سے نشاندہی ہوتی ہے، اس کی تشریح و توضیح کی گئی ہے قرآن مجید نے اللہ کی جانب جن افعال کی نسبت کی ہے، جیسے خیر و شر کی تخلیق، ہدایت و ضلالت جبر و اختیار، اور رویتِ الٰہی وغیرہ، ان پر مولانا نے جو فکر انگیز بحث کی ہے، اس سے اُن کی صحیح حقیقت اس طرح سامنے آجاتی ہے کہ اللہ کی شان و عظمت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا، اور وہ سب اختلافات اور الجھنیں بھی رفع ہو جاتی ہیں جو قدیم متکلمین کی کتابوں میں موجود ہیں؛ دوسرے باب میں عقیدۂ رسالت کا ذکر ہے، اس میں نبوت کی ضرورت، انبیاء کے منصب، اُن کی عصمت، وحی کی صحت کے دلائل، شفاعت، بندوں کی جانب سے اللہ کی جناب میں رسول کی عرض و معروض، تبلیغ، ہجرت اور معجزہ وغیرہ کے بارہ میں قرآنی نقطۂ نظر کی وضاحت عالمانہ انداز میں کی گئی ہے، آخری حصہ معاد کے متعلق ہے، مگر یہ بہت مختصر ہے، اس میں پہلے معاد کا توحید و رسالت سے تعلق دکھایا گیا ہے، پھر جنت و دوزخ کی حقیقت اور معاد جسمانی و روحانی وغیرہ پر مولانا نے اپنے خاص انداز میں کلام کیا ہے، اُن کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ بھی نامکمل اور غیر مرتب ہے تاہم اس کی بعض بحثیں نہایت مفید اور اسرار و حقائق سے معمور ہیں، جن کو پڑھ کر بڑی بصیرت اور عقائد کے بارہ میں قرآنی نقطۂ نظر سے واقفیت ہوتی ہے، اور قدم قدم پر کلام مجید میں ان کی دقتِ نظر اور نکتہ رسی کا ثبوت ملتا ہے، دائرہ حمیدیہ کے لائق ناظم اور مولانا فراہی کے افکار و علوم کے خاص اداشناس مولانا بدر الدین اصلاحی اس کی ترتیب و اشاعت پر اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں، شروع میں اُن کا پر مغز دیباچہ بھی ہے جس میں کتاب کی خصوصیات اور اسکے مباحث کا شگفتہ انداز اور دلآویز پیرایے میں تعارف کرایا گیا ہے،

معرفتِ کعبہ: مرتبہ مولوی معین الدین صاحب رہبر فاروقی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۲۰ قیمت ۴ روپئے (۱) معین الدین رہبر فاروقی بیرون یاقوت پورہ محلہ: - علی بن مکان نمبر ۱۷-۳-۵-۴، حیدرآباد، آندھراپردیش (۲) کوثر بک ایجنسی چھتہ بازار حیدرآباد ۲

یہ کتاب خانۂ کعبہ کی فضیلت واہمیت، حرمت و تقدس اور مرکزیت و مرجعیت بیان کرنے کے لئے لکھی گئی ہو، اس کی تقریب سے مکہ معظمہ کی عظمت اور حج کے مقاصد، فوائد و برکات اور مناسک کا بھی مفصل ذکر اور اُن سے متعلق آیتوں اور حدیثوں کی تشریح بھی ہے، اس حیثیت سے یہ بڑی مفید اور خانۂ کعبہ اور اس کے آثار و مشاہد کے متعلق گوناگوں معلومات پر مشتمل ہے، مگر مصنف نے بعض ضعیف تفسیری روایتیں اور غیر محقق واقعات بھی نقل کئے ہیں، اس لئے اس میں رطب کے ساتھ کہیں کہیں یابس بھی شامل ہو، گو کتاب میں ذیلی عنوانات اکثر دئیے گئے ہیں لیکن اگر مستقل ابواب قائم کرکے کعبہ، مکہ اور حج کا علحدہ علحدہ ذکر ہوتا، تو کتاب کی ترتیب بھی زیادہ بہتر ہوتی، اور اس کا فائدہ بھی دوچند ہوتا، تاہم یہ محنت اور غور و فکر سے لکھی گئی ہے، حج اسلام کا بنیادی رکن اور بیت اللہ ملتِ ابراہیمی کی عظیم الشان یادگار ہے، اُن کی اہمیت و تقدس سے واقف ہونے کے لئے اس کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے،

بارہ ماسہ نہیمہ: مرتبہ جناب سید نذر الحسن صاحب قادری، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات: ۴۶، قیمت دو روپے پچیس پیسے، پتہ: مکتبہ قادری، رامپور،

مولوی حفظ اللہ قادری رامپوری گذشتہ صدی کے صاحب تصنیف بزرگ اور اردو، فارسی اور ہندی بانوں کے قادر الکلام شاعر تھے، زیر نظر بارہ ماسہ میں جو ان کی جدتِ طبع کا نتیجہ اور اودھی زبان میں ہے، بارہوں فصلی مہینوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں، یہ کبھی چھپا نہیں تھا، مگر رامپور کے اکثر دیہاتی لوگوں کو زبانی یاد تھا، مرتب نے ان ہی لوگوں سے مل کر اس کو یکجا کیا، اور کتابی صورت میں شائع کرایا، ابتداء میں انھوں نے مولوی صاحب کے مختصر حالات اور تصنیفات کا تعارف بھی کرایا ہو، مگر بارہ ماسہ کی خصوصیات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا گیا ہے،

"ض"